ماہنامہ

# قلندر شعور

نومبر ۲۰۲۰ء

سُکون زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے
اور رُوح کے عرفان کے بغیر سُکون نہیں مِلتا

جلد 8 شمارہ 10 | نومبر 2020ء | ربیع الاوّل ـ ربیع الثانی 1442ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ شعور کراچی

# قلندر شعور

Neutral Thinking

(اردو ـ انگریزی)

سرپرست اعلیٰ

حضور قلندر بابا اولیاء رحمۃ اللہ علیہ

چیف ایڈیٹر

خواجہ شمس الدین عظیمی

ایڈیٹر

حکیم سلام عارف

سرکولیشن منیجر

محمد ایاز

بااہتمام عظیمی یونیورسٹی پریس ـــ پبلشر شاہ عالم عظیمی نے ابن حسن آفسیٹ پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم، کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

فی شمارہ 80 روپے..... سالانہ ہدیہ 1080 روپے رجسٹرڈ ڈاک کے ساتھ، بیرونِ پاکستان 70 امریکی ڈالر سالانہ

B-54، عظیمی محلّہ، سیکٹر C-4 سرجانی ٹاؤن کراچی، پاکستان۔ فون نمبر: 6912020 213 (0) 92+

# ۳۶ مضامین کا گُل دان

| | | |
|---|---|---|
| حمد باری تعالیٰ | راسخؔ عرفان | 10 |
| نعت رسول مقبول ﷺ | صابر نو بہار سنگھ | 11 |
| رباعیات | ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاؒ | 12 |
| آج کی بات | مدیر مسئول | 14 |
| فقیر کی ڈاک | ادارہ | 19 |
| نامے میرے نام | خانوادہ سلسلہ عظیمیہ | 21 |
| خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا | ملک محمد ناصر | 25 |
| ٹیلی فون کا نوعی ریکارڈ | شاہد احمد (عجمان) | 29 |
| زندگی ایک نہیں ـــ دو ہیں؟ | قلم اور کاغذ | 35 |
| پیراسائیکالوجی سے مسائل کا حل | خواجہ شمس الدین عظیمی | 41 |
| یا اللہ! میں جانتا نہیں، یہ مانتا نہیں | بی بی ایمن | 45 |
| وقت کیا ہے ـــ؟ | حامد ابراہیم (M.A-Fine Arts) | 51 |
| دس ہزار برس پرانی ڈائری | سید نوشاد کاظمی | 57 |
| حضرت حمید الدین ناگوریؒ | شازیہ رشید | 63 |
| اقتباسات | قارئین | 67 |
| دارِ فانی کے چالیس سال | مجتبیٰ حسین | 69 |
| ہم نماز میں کہاں ہوتے ہیں؟ | عابد محمود | 75 |

خلوص ــــــــــــــــــــ عثمان طاہر 81

مینڈکوں کی بستی ــــــــــــــــــ (M. Phil Supply Chain) بلال حسن 87

انڈا پہلے ہے یا مرغی؟ ــــــــــــــــــ ••• 93

ستمبر 2020ء کے سرورق کی تشریح ــــــــــــــــــ قارئین 98

کِس نے کہا اور کِس نے سنا ــــــــــــــــــ عرفانہ شہزاد 101

جراثیم کش ـــ لوبان ــــــــــــــــــ نیّر اعظم 109

کفایت شعار بیوی ـــ فضول خرچ شوہر ــــــــــــــــــ صائمہ مجید 113

پورب کے ہم زاد ــــــــــــــــــ (M.Sc. Applied Physics) محمد عدنان خان 119

اللہ میاں کے باغ کے پھول ـــ

اولی الالباب بچے ــــــــــــــــــ ادارہ 125

نوفٹ کا ببر شیر ــــــــــــــــــ مترجم: حسن منہاس 127

سمجھ سمجھ کر ـــ سمجھ کو سمجھو ــــــــــــــــــ نداحامد 133

آپ کے خواب اور ان کی تعبیر ــــــــــــــــــ خواجہ شمس الدین عظیمی 135

146 Bibi Anuradha (UAE) ــــــــــــــــــ Circle of Life

148 Fatima Zubair ــــــــــــــــــ The Mystery of Dark Spot

152 Umar Tariq ــــــــــــــــــ Dimensions of Wellness

156 Nadra Mubeen ــــــــــــــــــ Existence of Love

161 Roshan Sitara ــــــــــــــــــ Impermanence

167 Qurat-ul-Ain Wasti ــــــــــــــــــ If the Vessel is Filled...

172 K.S.Azeemi ــــــــــــــــــ Message of the Day

# حمد باری تعالیٰ

راسخؔ عرفان

تو ذوالجلال ہے تو خدائے قدیر ہے
یکتا ہے لاشریک و علیم و بصیر ہے

توصیف لکھ رہا ہوں تیرے کمال کی
طاری دل و دماغ پہ کیفِ صریر ہے

گردابِ حادثات میں گھِر کر بھی اے خدا!
دل ہے کہ تیرے ذکر سے راحت پذیر ہے

شاہ و وزیر منعم و محکوم و حکمراں
جو شخص بھی ہے تیرے ہی در کا فقیر ہے

حاوی ہے تیرا علم قریب و بعید پر
تو اعلم الغیوب و سمیع و بصیر ہے

حاصل ہو جس کو تیری محبت کی روشنی
دراصل آدمی وہی روشن ضمیر ہے

راسخؔ، کرم ہے اس کا شمیم بہار خلد
اس کا عتاب شعلۂ نار سعید ہے

# نعت رسول مقبول ﷺ

صابر نو بہار سنگھ

سالارِ امم محبوبِ خدا اے سرورِ عالم صلِ علیٰ
اے ماہِ عرب تنویرِ ہدا اے سرورِ عالم صلِ علیٰ

اے رونقِ بزمِ ارض و سما صد فخرِ ملا صد نازِ خلا
اے زینتِ کرسیِ عرشِ علا اے سرورِ عالم صلِ علیٰ

اے چشمۂ رحمتِ جود و سخا معروف ہے فیضِ عام ترا
اے بندہ نوازِ شاہ و گدا اے سرورِ عالم صلِ علیٰ

تجسیمِ خلوص و صدقِ و صفا تصویرِ خضوع و فقر و غنا
اے گوشہ نشینِ غارِ حرا اے سرورِ عالم صلِ علیٰ

کیا قوسِ قزح کیا ابرو ہوا کیا مہر و شما کیا ارض و سما
سب تیری ثنا میں نغمہ سرا اے سرورِ عالم صلِ علیٰ

سینے میں ہو شمعِ حق کی ضیا ہونٹوں پہ ہو تیری حمد و ثنا
گن گاؤں میں تیرے صبح و مسا اے سرورِ عالم صلِ علیٰ

## نقاشِ ازل نے کیوں بنایا ہے مجھے

مٹی کے لباس میں چھپایا ہے مجھے
مٹی کی کشش سے آزمایا ہے مجھے
معلوم نہیں غبار سے مٹی کے
نقاشِ ازل نے کیوں بنایا ہے مجھے

”ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا۔“ (المؤمنون:۱۲)

ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ کی یہ رباعی تخلیق کے راز پر غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔ چاروں مصرعوں پر بالترتیب تفکر سے حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ آدمی مٹی (خلا) ہے۔ اصل مٹی کے پسِ پردہ ہے گویا کہ جس طرح لباس جسم نہیں ہوتا، جسم لباس کے اندر ہوتا ہے۔ لباس کی حیثیت ثانوی ہے۔ باطنی نگاہ دیکھتی ہے کہ اصل انسان مٹی کے لباس میں چھپا ہوا ہے۔

دوسرے مصرعہ میں مٹی میں قید کا اہم سبب بیان کیا گیا ہے کہ ہماری دنیا، آزمائش ہے۔ آدمی دنیا کو قیمتی سمجھ کر اس میں دل لگا لیتا ہے حالاں کہ دنیا کی حقیقت مٹی کے سوا کچھ نہیں۔ پیدا ہونے سے مرنے تک مٹی کی بدلتی ہوئی شکلیں فریبِ نظر ہیں۔ خالق کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے آدمی مٹی کی شکلوں میں کھویا رہتا ہے۔ اگر وہ تفکر کی حقیقت سے آشنا ہو جائے تو ”لا الٰہ“ اور ”الا اللہ“ کا راز جان لے گا۔

تیسرے مصرعہ میں آدمی کو مٹی کا غبار کہا گیا ہے۔ مٹی روشنیوں کا خلط ملط ہے جس میں تمام رنگ ہیں۔ اسے کُل رنگ روشنی بھی کہتے ہیں لیکن آدمی اس سے بے خبر ہے۔ اس لئے حضور قلندر بابا اولیاؒ چوتھے مصرعہ میں دعوتِ تفکر دیتے ہیں کہ آدمی جان لے کہ اس کی پیدائش مٹی سے کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آدم کو مٹی سے بنایا تو ہر آدمی مٹی سے بنا ہے۔ نہ صرف آدمی بلکہ زمین پر تمام موجودات اور وسائل مٹی ہیں۔ گویا سب اشیا مٹی کی بدلتی ہوئی شکلیں ہیں جنہیں نقاشِ ازل نے اس لئے بنایا ہے کہ اگر آدمی اپنی حالت پر تفکر کرے تو اس پر زمان و مکان کے در کھل جائیں گے، وہ مٹی کے پسِ پردہ حقیقت ”روح“ (اپنی اصلیت) کو جان لے گا اور روح کا علم اسے ان قاعدوں، ضابطوں اور فارمولوں کی واقفیت دے گا جن پر کائنات قائم ہے۔ مخلوقات میں افضل ہونے کی یہی صورت ہے بہ صورت دیگر آدمی کی حیثیت مٹی کے پتلے کی ہے۔

# آج کی بات

انسان پر زمانے میں ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جب زمانیت اور مکانیت مغلوب تھی۔ انسان موجود تھا لیکن قابلِ تذکرہ نہیں تھا۔ فرد کا تذکرہ نقش و نگار اور نقش و نگار میں حرکت سے ہوتا ہے جس کو گھٹنا بڑھنا کہتے ہیں۔ گھٹنے بڑھنے سے زندگی مظہر بنتی ہے۔ گھٹنے سے نقش و نگار سمٹتے ہیں اور بڑھنے سے پھیل جاتے ہیں لیکن یہ گھٹنا بڑھنا مخفی ہے۔ سمٹنے کا عمل موت اور بڑھنے کا عمل زندگی ہے اور دونوں ایک ہیں۔ رب العزت اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

" اور موت سے زندگی نکالتا ہے اور زندگی سے موت کو۔" (اٰل عمرٰن: ۲۷)

زندگی مقداروں پر قائم ہے اور مقداریں مقرر ہیں۔ روشن ضمیر خواتین و حضرات کا دیکھنا ہے کہ جب حرکت کی مقدار اپنی توانائی پوری کر لیتی ہے تو لوٹ کر مزید توانائی کے لئے اُس مقام سے رجوع کرتی ہے جہاں سے توانائی آرہی ہے۔ غور طلب ہے کہ حرکت بظاہر ایک مقام پر بے حرکت ہوئی تو دوسرے مقام پر متحرک ہوگئی۔ اس طرح حیات و ممات* کا عمل جاری ہے یہاں تک کہ گھٹنے بڑھنے کی مقداریں پوری ہو جاتی ہیں۔

•• ———— ••

موت سے زندگی اور زندگی سے موت کے قانون کو سمجھنے کے لئے مشق کیجئے۔
مشق کے لئے گھڑی پاس رکھئے۔

---

* حیات و ممات (زندگی اور موت)

① پہلا مرحلہ: جس کمرے میں آپ بیٹھے ہیں، وہاں کی لائٹ بند کر دیجئے۔ لائٹ بند کرنے سے اندھیرا ہو گیا۔ بتایئے جو روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی، وہ کہاں چلی گئی ــــ؟ کیا اس کا وجود ختم ہو گیا یا وہ خلا میں تحلیل ہو گئی ــــ؟ دونوں جواب درست نہیں۔ لائٹ بند کرنے سے روشنی بلب سے وابستہ تاروں میں واپس چلی گئی جہاں بجلی ذخیرہ ہے ــــ اور تار گرڈ اسٹیشن سے منسلک ہیں۔

② دوسرا مرحلہ: لائٹ کھول دیجئے تاکہ کمرا روشن ہو۔ پانچ سیکنڈ روشن بلب دیکھئے اور دس سیکنڈ بلب سے روشن کمرے کا جائزہ لیجئے۔ جو محسوس ہو، کاغذ پر لکھ لیجئے۔

کمرے میں پھیلی ہوئی روشنی بکھر کر بھی بلب سے الگ نہیں، وہ مستقل بلب میں موجود بجلی کی تاروں سے منسلک ہے۔ جس لمحے روشنی کا بجلی سے رابطہ منقطع ہوتا ہے، بٹن بند کئے بغیر کمرے میں اندھیرا ہو جاتا ہے۔

③ تیسرا مرحلہ: ایک مرتبہ پھر اندھیرا کیجئے۔ اس بار کمرے کو موم بتی سے روشن کیجئے۔ پلک جھپکائے بغیر ایک منٹ موم بتی کی لَو دیکھئے۔ مقررہ وقت سے پہلے پلک جھپکے گی تو عمل از سرِ نو کیجئے۔ نظر ایک نقطے پر قائم ہو جائے تو آپ لَو کے بیک وقت تیزی سے جلنے بجھنے یا پھیلنے اور سمٹنے کا عمل دیکھیں گے۔ روشن رہنے کے لئے لَو کا سمٹنا ضروری ہے کیوں کہ جب لَو سمٹتی ہے تو ماخذ (source) سے رجوع کرتی ہے۔ تجربے سے جو مشاہدہ ہو اور مشاہدے سے جو بات فہم میں داخل ہو، معنی پہنائے بغیر فوراً کاغذ پر لکھ لیجئے۔

یہ زندگی کا موت میں داخل ہونا اور موت کا زندگی بننا ہے۔ تجربہ بلب کو مرکز بنا کر بھی ہو سکتا ہے لیکن بلب کے بیرونی گلاس یا پروٹیکٹر کی وجہ سے عام آدمی کے لئے مشاہدہ مشکل ہے کیوں کہ اسے illusion سے آزاد ہونا ضروری ہے۔

زندگی دورخ کی پابند ہے اور دورخ کی ابتدا استقرارِ حمل سے ہوتی ہے۔ استقرارِ حمل میں نقش و نگار نہیں ہوتے۔ جیسے جیسے رحمِ مادر میں اسپرم کی نشوونما ہوتی ہے ـــــ نقش و نگار بنتے رہتے ہیں۔ مفہوم یہ ہے کہ نقش و نگار کہیں سے آتے ہیں، آنے کا عمل زمانیت ہے اور نقش و نگار کا مظاہرہ مکانیت ہے۔

پیدائش کے بعد دوسری حقیقت موت ہے۔ موت کے بعد نقش و نگار موجود رہتے ہیں مگر خود پر سے مٹی کا پرت (لباس) اتار کر اعراف کی دنیا کے پرت میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اس طرح مٹی، مٹی میں مل جاتی ہے مگر نقش و نگار باقی رہتے ہیں اور زندگی اِس عالم میں بے حرکت ہو کر دوسرے عالم میں متحرک ہو جاتی ہے۔

زندگی اور نقش و نگار الگ الگ ہیں۔ اسپرم میں نقوش نقطے میں بند ہیں۔ ہر اسپرم سے بچہ نہیں بنتا۔ صرف وہی اسپرم نشوونما کے مرحلے سے گزرتا ہے جس میں حرکت یا زندگی داخل ہوتی ہے۔ حرکت نظر نہیں آتی۔ زندگی بھی نظر نہیں آتی۔ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں، وہ ان دونوں کا مظاہرہ ہے۔ مظاہرہ حقیقت نہیں لیکن حقیقت سے الگ بھی نہیں۔

جس طرح جذبات کا اظہار الفاظ اور تاثرات کے ذریعے ہوتا ہے اسی طرح زندگی کا مظاہرہ نقش و نگار میں حرکت سے ہے۔ آپ الفاظ کو جذبات نہیں کہہ سکتے۔ جذبات اور ہیں ـــــ الفاظ جذبات کا اظہار ہیں۔

مثال : سر میں درد ہے۔ درد بڑھتا ہے تو کہتے ہیں کہ سر میں شدید درد ہے۔ درد اور بڑھتا ہے تو اظہار کے لئے لفظ ”شدید“ کم زور محسوس ہوتا ہے۔ نتیجے میں ہم کہتے ہیں کہ درد ناقابلِ برداشت ہے۔ درد میں مزید اضافہ ہونے پر لگتا ہے کہ ”ناقابلِ برداشت“ کے الفاظ بھی درد میں شدت کی وضاحت سے قاصر ہیں۔

نقش و نگار کی تخلیق، ان کو قائم رکھنے اور ان میں حرکت پیدا کرنے والی ہستی آنکھوں

سے نظر نہیں آتی مگر اس نظر نہ آنے والی ہستی پر زندگی قائم ہے۔

"آج کی بات" میں رموز ہیں۔ آپ کیا سمجھے___؟

• • ———————— • •

خلاصہ : جب کچھ نہیں تھا تو اللہ تھا۔ اللہ نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں۔ پہچان کے لئے کائنات کی تخلیق کا ارادہ کیا اور کائنات بن گئی۔ جب تک مخلوقات غیب میں تھیں، ناقابلِ تذکرہ تھیں۔ اللہ نے ان کو ظاہر کر کے انفرادیت عطا کی اور انفرادیت سے زمانی و مکانی طرزیں وجود میں آگئیں یعنی مخلوق سننے، دیکھنے، محسوس کرنے اور بولنے لگی۔

△ سننا، دیکھنا، محسوس کرنا اور بولنا مکانیت ہے۔

○ مکانیت میں حرکت منتقل ہونا زمانیت ہے۔

علمِ حصولی کے مطابق "آدمی خون کی گردش اور سانس کی آمد و رفت سے زندہ ہے۔ اوسط شخص کا دل فی منٹ 72 مرتبہ دھڑکتا ہے۔" خون جتنی قوت سے پمپ ہوتا ہے، گردش تیز ہوتی ہے۔ دھڑکن کے تناسب سے خون پورے جسم میں فی منٹ 72 چکر مکمل کرتا ہے۔ اس میں بال بھی شامل ہیں۔ یعنی خون زندہ رہنے کے لئے 72 مرتبہ دل سے رجوع (موت) کرتا ہے اور ازسرِ نو توانائی لے کر دوبارہ گردش (زندگی) میں آتا ہے۔ اس طرح خون پر ہر لمحہ موت وارد ہونے سے زندگی جاری رہتی ہے۔ یہی کیفیت سانس کی ہے۔ سانس اندر لینے کے بعد باہر نہ آئے تو موت سے زندگی اور زندگی سے موت کا سفر رک جاتا ہے۔ یعنی مخلوق ہر لمحہ موت سے گزر کر زندہ ہوتی ہے۔

توانائی اندر سے ملتی ہے۔ توانائی کا مخزن ایسی ہستی ہے جو زندگی کی ضامن اور رگِ جان سے زیادہ قریب ہے۔ رگِ جان سے زیادہ قریب ہستی سے واقف ہونے کا لمحہ وہ ہے

جب زندگی موت میں داخل ہوتی ہے اور موت زندگی بن جاتی ہے۔

• • ——————— • •

ایک دن کا بچہ جب عالمِ ارواح سے آتا ہے اور یہ ایک دن غیب ہو جاتا ہے تو دوسرا دن پیدا ہوتا ہے۔ پیدائش اور موت تغیر ہیں۔ مرنے کا مطلب ایک زون سے دوسرے زون میں منتقل ہونا ہے۔ موت ـــــ انتقالِ مکان ہے۔

" اور تم کیا سمجھے کہ سجّین کیا ہے۔ کتاب ہے لکھی ہوئی۔" (المطففین:۸۔۹)

"اور تم کیا سمجھے کہ علّیین کیا ہے۔ کتاب ہے لکھی ہوئی جسے مقربین دیکھتے ہیں۔" (المطففین:۱۹۔۲۱)

◡ علّیین آرام واستراحت، مسرت وشادمانی، سکون اور دل کا دیکھنا ہے۔

△ سجّین اضطراب وتکلیف، حسرت ورسوائی، بے سکونی اور فریبِ نظر ہے۔

◯ جو کچھ علّیین اور سجّین کی کتاب میں ہے، اللہ کے دوست اس ریکارڈ کو دیکھتے ہیں۔

زمانے کے دو رخ متعین ہیں۔ ایک دن غیب ہے، دوسرا دن ظاہر ہے ـــــ لیکن ظاہر بھی غیب ہے کہ وہ غیب سے ظاہر ہوتا ہے اور غیب میں چھپ جاتا ہے۔ اس لئے پہلے دن غیب ہونا، دوسرے دن ظاہر ہونے کی بیلٹ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

" اور موت سے زندگی نکالتا ہے اور زندگی سے موت کو۔" (اٰل عمرٰن: ۲۷)

تفکر کرنے پر یہ مرحلہ سامنے آتا ہے کہ زندگی موت سے اور موت زندگی سے نکلتی ہے۔ اس راز کا مشاہدہ ان خواتین وحضرات کو ہوتا ہے جو تفکر میں یکسو ہو جاتے ہیں۔

قارئین! "آج کی بات" سمجھنے کے لئے بزرگوں، اساتذہ کرام اور ہم خیال دوستوں سے مشورہ کیجئے۔

اللہ حافظ

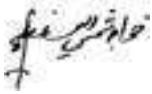

# فقیر کی ڈاک

تفکر ـــ ذہن کی دنیا میں داخل ہونے کا راستہ ہے۔ تفکر سے خیال کی گہرائیاں روشن ہوتی ہیں۔ گہرائی میں تخلیقی رموز کے خزینے ہیں جن تک رسائی ـــ عرفانِ نفس اور معرفتِ الٰہی ہے۔ ”فقیر کی ڈاک“ اذہان کی آبیاری ہے جس میں مرشد کریم خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب ذہن کے پرتوں کو کھول کر لاشعور کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

---

محترم عظیمی صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مسائل کے حل سے متعلق آپ کی ایک تحریر نظر سے گزری جس میں آپ نے کسی کو بینائی کی بحالی کے لئے سورج بینی کا علاج بتایا تھا۔ کیا میں جان سکتا ہوں کہ سورج بینی سے کس طرح بینائی بحال ہوتی ہے اور چشمے سے کیوں کر نجات مل جاتی ہے؟ شکریہ۔

محمد ارشد۔ کراچی

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ،

سورج کی طرف دیکھنے سے فضا میں جو لہریں گشت کرتی ہیں، وہ لہریں آنکھوں کے ذریعے، چہرے کے ذریعے، بالوں کے ذریعے دماغ کے اندر داخل ہوتی ہیں۔ دماغ کے ریشے اور آنکھوں کے ریشوں میں جو فیکٹریاں عمل کرتی ہیں، ان فیکٹریوں کو سورج کی لہروں سے توانائی حاصل ہوتی ہے اور یہ توانائی ان کے اندر جذب ہو جاتی ہے۔ صبح طلوعِ آفتاب کے وقت فضا میں ایسی توانائی کا ذخیرہ ہوتا ہے جن سے بطور خاص انسانی صحت، حواس، دل و دماغ کی بہت سی قوتیں اور بیش بہا صلاحیتیں نمو پاتی ہیں۔ ان میں ایک صلاحیت ”باصرہ“ ہے۔ قوتِ باصرہ کی آسان تعریف پڑھئے۔

> ” باصرہ یا نگاہ ایسی حالت ہے جو کسی چیز سے واقف ہونے کی تصدیق کرتی ہے، اس طرح کہ وہ چیز فی الوقت موجود ہے یعنی ایک تو کسی چیز کا ذہنی طور پر وقوف حاصل ہے۔ یہ

عمل تو حافظہ سے تعلق رکھنے والی بات ہے لیکن جب حافظہ اپنی یادداشت کو تازہ کرنا چاہتا ہے یا کوئی بیرونی محسوس حافظہ میں کسی یادداشت کو بیدار کرتا ہے اس وقت باصرہ جو پلک کے مسلسل عمل سے اس وقوف کے خدوخال اور شکل وصورت دیکھنے کے لائق ہو چکی ہے، اس کے سامنے ہونے کی تصدیق کرتی ہے۔" (کتاب: لوح وقلم)

نکلتے سورج کی سرخ رنگ ٹکیہ کا عکس جب آنکھ کے ریشوں اور عضلات پر پڑتا ہے تو آنکھ کے تمام عضلات اور اعصاب کو خصوصی نشوونما ملتی ہے اور اس نشوونما کو سورج کی شعاعیں توانائی بخشتی ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ توانائی بینائی بحال ہونے کا ذریعہ اور مقام بن جاتی ہے اور آنکھوں پر سے چشمہ اتر جاتا ہے۔

سورج بینی کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ نکلتا ہوا سورج ایک منٹ سے زیادہ نہ دیکھا جائے۔ جس جگہ بیٹھ کر سورج بینی کی جائے وہاں کا ماحول صاف ستھرا ہو، فضا میں دھواں یا گرد وغبار نہ ہو۔ آسمان اگر ابر آلود ہو تب بھی وقت مقررہ پر مشرق کی طرف منہ کر کے بیٹھ جانا چاہئے۔

تجربہ میں یہ بات آتی ہے کہ اگر مسلسل اور متواتر چھ ماہ تک سورج بینی کر لی جائے تو آنکھوں پر سے چشمہ اتر جاتا ہے۔ اس کی مثال میں خود ہوں۔ اس فقیر نے اپنے پیرومرشد ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ کی اجازت اور نگرانی میں چھ ماہ تک سورج بینی کی تھی جس کے نتیجے میں آنکھوں پر سے چشمہ اتر گیا تھا۔ اس علاج کا اثر بارہ سال تک برقرار رہا۔

سورج بینی کا علاج "اجازت" سے اور "صاحبِ علم وعرفان" کی نگرانی میں کیا جاتا ہے ورنہ نقصان ہوتا ہے۔ یہ علاج ہر شخص کے لئے نہیں ہے۔ ایک مرض کے کئی درجات ہوتے ہیں اور اس کے مطابق علاج تجویز کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ماہر امراضِ چشم (eye specialist) سے مشورہ کرنا مفید ہے۔ زیادہ مناسب ہے کہ مشورہ کر لیا جائے۔

دعاگو، عظیمی

07 جنوری، 1980ء

# نامے میرے نام

کرم فرما خواتین و حضرات نے ''ماہنامہ قلندر شعور'' کو دل کی گہرائیوں سے نہ صرف پسند کیا ہے بلکہ قبول فرما کر روپ بہروپ کو دلہن کا روپ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں قارئین کی خدمت کی توفیق دیں۔ رابطے کے قدیم و جدید وسائل کے ذریعے موصول ہونے والے خطوط میں سے منتخب خطوط شائع کئے جا رہے ہیں۔

---

ستمبر 2020ء کے ''آج کی بات'' پر موصول شدہ تفکر میں سے منتخب خطوط:

**مرسلین احمد (اسلام آباد):** تالاب کائنات کی تمثیل ہے اور ساکت تالاب ''ہو'' کے عالم کی مانند ہے۔ اللہ کے حکم ''کُن'' سے کائنات تخلیق ہوئی اور مخلوقات ظاہر ہو گئیں۔ ابھی مخلوقات میں حواس بیدار نہیں ہوئے تھے۔ کائناتی خلا (تالاب) میں ''الست بربکم'' کا حکم داخل ہوا تو لہریں ظاہر ہونا شروع ہو گئیں جیسے ساکت تالاب میں کنکر پھینکنے سے لہریں نمودار ہوتی ہیں۔ یہ حواس کی بیداری ہے۔ کنکر کی آواز سے تالاب کی سطح پر دائرے بنتے اور پھیلتے ہیں اور کناروں پر پہنچ کر غائب ہو جاتے ہیں۔ غور طلب ہے کہ دائروں کا وجود تالاب میں ہے اور دائروں کا فنا ہونا بھی تالاب کے اندر ہے۔ کوئی دائرہ تالاب کے بغیر کچھ نہیں اور نہ ہی تالاب کے باہر دائرہ ہے۔

**عبداللہ خان (پشاور):** ابتدا، انتہا، ظاہر اور باطن جب ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو خلا بنتا ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا ابتدا، انتہا، ظاہر اور باطن خلا نہیں ہیں؟ اسی لئے ان کے ملنے سے خلا بنتا ہے؟ جب یہ ملتے ہیں تو ڈائی مینشن ظاہر ہوتا ہے اور ڈائی مینشن خلا ہے۔

**رخسانہ جبیں (فیصل آباد):** کاغذ پر لکیریں بنانے سے شکل بنی۔ لکیروں کو مٹایا تو شکل غائب ہو گئی۔ تفکر سے ذہن میں بات آئی کہ جب زندگی مثلث، تکون یا ٹرائنگل میں ہو تو شعوری حواس میں ہوتی ہے۔ مثلث سے باہر زندگی لاشعوری حواس یعنی دائرے میں داخل ہوتی ہے۔ چوں کہ دائرے میں نور ہے، اس طرح لاشعوری حواس اللہ کی قربت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ نور مثلث میں بھی ہے لیکن حواس شعور میں قید ہونے کی وجہ سے نظر محدود ہے۔

**سعد لاکھانی (کراچی):** پانی کی مشق سے میں نے سیکھا کہ زندگی پانی ہے اور پانی تغیر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''ہم نے ساری مخلوقات پانی سے پیدا کیں۔'' مخلوقات میں تغیر پانی کی وجہ سے ہے۔ مشق کے بعد دوسرا مرحلہ تغیر کو جاننا تھا۔ تغیر کے معنی دوری ہے۔ بچپن میں تغیر آتا ہے تو لڑکپن ظاہر ہوتا ہے اور بچے کو بچپن سے دور کر دیتا ہے۔ رات دن، سردی گرمی، جذبات، تقاضے وغیرہ سب میں یہی میکانزم ہے۔

**شکیلہ شبیر (فیصل آباد):** مخلوقات کا شعور وسیع ہو کر تالاب کے کناروں تک پھیلتا ہے یہاں تک کہ کنارے پر پہنچ کر گم ہو جاتا ہے۔ ''گم ہونا'' اصل زندگی ہے۔ کناروں تک پہنچنے سے پہلے شعور، لاشعور سے واقف ہو جائے تو اس کے معنی '' مرنے سے پہلے مر جاؤ'' کے ہیں۔ اس مقام تک رسائی کے لئے شعور کو انفرادی دائرے سے نکل کر نوعی اور کائناتی دائرے میں داخل ہونا ہوگا۔ زندگی لہروں پر قائم ہے اور لہروں کی اصل نور ہے۔ نور کی بساط پر تمام تخلیقات ہو چکی ہیں۔

**محمد عثمان (کراچی):** سنیما میں فلم دیکھتے ہوئے عقب میں دیکھیں تو چھوٹے گول سوراخ میں سے روشنی کی بیم نکلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے جو لہروں پر مشتمل ہے۔ لہریں دائیں بائیں، اوپر نیچے اور آڑھی ترچھی سمت میں اسکرین کی جانب آتی ہیں اور ان میں حرکت کی مناسبت سے اسکرین پر مناظر ظاہر ہوتے ہیں۔ لہریں ایک دوسرے میں خلط ملط نہیں ہوتیں۔

**حرا مقصود (فیصل آباد):** سفید کاغذ پر دائرے اور مثلث کی مشق سے انکشاف ہوا کہ جب تک لکیریں کاغذ پر موجود تھیں، ان میں اشکال نظر آئیں۔ لکیریں بننے سے پہلے شکلیں نظر کیوں نہیں آتیں؟ کائناتی قانون کے مطابق لکیریں دراصل لہریں ہیں جن میں ساری مخلوقات چھپی ہوئی ہیں۔ لہر یا لکیر کو جیسے ہی اسکرین ملتی ہے، یہ ان چیزوں کا مظاہرہ کرتی ہے جو اس کے اندر ہیں۔

★ —— ★ —— ★

ستمبر 2020ء کے مضامین پر قارئین کی آراء اور تبصرے:

**طیبہ صدف (چین):** روحانی مشن کو بیجنگ میں پھیلانے کے لئے دعا کی طلب گار ہوں۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ راستے آسان کر دے۔ ''آج کی بات'' کو کلاس بنا کر سیکھنے کی تجویز اچھی ہے۔ مجھے بھی اس کلاس میں شامل کیجئے۔ اللہ ہم سب سے راضی ہو، آمین۔

**مصنفہ دردانہ نوشین خان (مظفر گڑھ):** ایک مخلص انسان کے توسط سے چند ماہ سے ''ماہنامہ قلندر شعور'' موصول ہو رہا ہے۔ یہ نہ ادبی رسالوں جیسا ہے نہ کمرشل ڈائجسٹ کی طرح ہے۔ اس کا مطالعہ

راحتِ قلبی اور علم و عرفان میں ارتقا ہے۔ پڑھتے ہوئے بھاری پن کا احساس نہیں ہوتا۔ حضور قلندر باباؒ کی رباعی اور تفسیر نکتہ وروں کے لئے مقامِ توجہ ہے۔ ''فقیر کی ڈاک'' میں فاروق بٹ صاحب کے مکتوب میں فکر رسا سوالات اٹھائے گئے ہیں۔ خصوصاً یہ سوال کہ خواب میں کسی کا کسی سے ملنا کیا ہے؟ اس میں حقیقی سوال یہ ہے کہ جن کو ہم خواب میں دیکھتے ہیں، کیا وہ وہی ہوتے ہیں؟ خواب میں ماضی بعید کے لوگ واضح طور پر موجود ہوتے ہیں۔ یہ بات لاشعور کے میموری کارڈ جیسی ہے۔ بلال حسن نے حضرت موسیٰؑ کی پیدائش اور پرورش کے حوالے سے '' موجیں، گہوارہ'' تحقیقی انداز میں لکھا ہے۔ مضمون '' روٹی خور'' نے حیاتِ انسانی کے معاشی پہلو کی اہمیت اجاگر کی ہے۔ '' ماہنامہ قلندر شعور'' میں ادبی چاشنی کے مضمون بھی مل جاتے ہیں جیسے ''پنجاب کے عوامی گیت''۔ ریسرچ اور سائنسی مضامین بھی ہیں۔ مثلاً ''آواز میں بند شخصیت''، ''انگور کھٹے ہیں''۔ اللہ پاک آپ کی بامقصد کاوش کو مزید ترقی دے، آمین۔

**ہاجرہ (ساہیوال):** تجویز ہے کہ ''آج کی بات'' کو روحانی کلاس کا درجہ دیا جائے۔ ہم درس و تدریس کے نظام کو روحانی علم کی حیثیت سے پڑھنا چاہتے ہیں۔

**عظیمیہ روحانی لائبریری (کریم پارک، لاہور):** آپ نے ہمیں قرآن کریم میں غور و فکر کی طرف راغب کر دیا ہے۔ قرآن کریم میں غور و فکر سے ذہن وسیع ہوتا ہے اور روحانی علوم حاصل کرنے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ دیگر قارئین کی طرح ہماری خواہش ہے کہ ''آج کی بات'' کو روحانی کلاس کا درجہ دیا جائے۔

**سعید انور (کراچی):** مضامین بہت اچھے ہیں۔ توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ رسالے میں ایک لفظ '' الوژن'' استعمال کیا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بہت سے افراد کو یہ لفظ سمجھنے میں مشکل ہوتی ہو۔ تجویز ہے کہ ساتھ میں ترجمہ یا انگریزی میں ''illusion'' لکھ دیں تاکہ نئے پڑھنے والے بآسانی سمجھ سکیں۔

**سیما راشد (کراچی):** ''ماہنامہ قلندر شعور'' روحانی تسکین اور آگہی دیتا ہے۔ اس کے مطالعے سے یکسوئی حاصل ہوتی ہے اور ذہن تفکر کی طرف مائل ہوتا ہے۔ ''آج کی بات'' آسان فہم ہے۔ معنوی اعتبار سے یہ رسالہ سطحی اذہان کے لئے ناقابل فہم ہے۔

**پروفیسر طاہر (چنیوٹ):** ماہ ستمبر کا شمارہ ہاتھ میں ہے۔ اس میں تحریروں سے تربیت کا عمل خوب سے خوب تر ہو رہا ہے۔ میرے خیال میں ''آج کی بات'' کو جن الفاظ میں بیان کیا جا رہا ہے، ان ہی الفاظ میں بیان کیا جائے۔ کم از کم ایسا مضمون ہونا چاہئے کہ جس کو سمجھنے کے لئے غور و فکر کرنا پڑے، بار بار پڑھنا پڑے تاکہ ذہن میں گہرائی پیدا ہو کیوں کہ زیادہ تفکر کرنے سے بند گرہیں کھلتی ہیں اور یہی تحریر کا مقصد

ہے۔ سرورق سمجھنے کے لئے بعض اوقات کسی سے مدد لینا پڑتی تھی مگر اب سرورق سمجھ میں آجاتا ہے۔

**درنایاب (کراچی):** عابد صاحب کی تحریر ''کہن، سنن اور کرن'' نے بہت متاثر کیا۔ ان کی کہانیاں اور افسانوں میں نکھار آگیا ہے۔ تحریر میں مقصدیت اور موضوعات میں تنوع ہے۔ بچوں کی تربیت کے حوالے سے محمد فرحان کا مضمون اچھا لگا۔ اس جملے نے توجہ حاصل کی کہ '' وہ آواز سن کر نہیں سیکھ رہا، آواز کے ذریعے ذہن میں منتقل ہونے والی تصویر دیکھ رہا ہے''۔ میں نے سوچا کہ ہم سب ذہن میں بننے والی تصویریں دیکھ رہے ہیں یعنی ہم باہر نہیں دیکھ رہے، اندر دیکھ رہے ہیں اور اندر دیکھنے کو باہر دیکھنا سمجھ رہے ہیں۔ یہی فریبِ نظر ہے۔ ذہن میں کون سی پلیٹ ہے جس پر تصویریں بنتی ہیں اور اس کا پروجیکٹر کہاں ہے؟

**اورنگ زیب (ملتان):** ستمبر 2020ء کا ہر مضمون اچھا ہے۔ ''موجیں، گہوارہ'' سرفہرست رہا۔ نفیسہ شاکر کے مضمون میں یہ بات پسند آئی کہ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ کسی کو اصلاح کی ضرورت ہے تو وہ شخص خود آپ ہیں۔ تجویز ہے کہ سال کے آخر یعنی دسمبر میں سال کے پانچ بہترین مضامین کا انتخاب کرنا چاہئے اور ان پانچ میں سے جو مضمون سب سے اچھا ہو، اسے دسمبر میں دوبارہ شائع کریں۔ یہ مضمون نگار کے لئے اعزاز ہوگا۔ اس سلسلے میں قارئین کی رائے بھی لینی چاہئے۔

★ **قارئین! اپنی رائے دیجئے۔**

**ڈاکٹر حفیظ احمد (لاہور):** سرورق کی تشریح کا انداز سائنسی جرنل کا ہو گیا ہے۔ خالص سائنسی اور روحانی پہلو پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اگر یہ اندازِ تحریر جاری رہا تو دو تین سال میں ایک اچھی کتاب بن جائے گی۔

**پروفیسر عفت جہاں (اسلام آباد):** کافی عرصے سے دیکھ رہی ہوں کہ خواب کی تعبیر میں اکثر صفائی کی طرف نشان دہی کی جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ لوگوں کے گمبھیر مسائل کی ایک وجہ صفائی نہ ہونا ہے۔ لوگ اپنے آپ اور گھر کو صاف نہیں رکھتے۔ مجھے شرمندگی ہوتی ہے کہ ہم من حیث القوم کس روش پر چل پڑے ہیں۔ صفائی نصف ایمان ہے۔ کیا لوگوں کو اچھا لگتا ہے جب تعبیر میں بتایا جاتا ہے کہ خواب میں صفائی نہ ہونے کی طرف اشارہ ہے؟ خواب کی تعبیر سب کو پڑھنی چاہئے اور دوسروں کے حالات سے سبق سیکھ کر اپنی روش درست کرنی چاہئے۔ الفاظ کی سختی کے لئے معذرت خواہ ہوں مگر سچ ہے کہ صفائی سے متعلق پڑھ کر افسوس ہوتا ہے۔ یہ میرا پہلا خط ہے، مؤدبانہ درخواست ہے کہ اسے شائع کریں۔

**نائلہ رضا (برطانیہ):** '' فقیر کی ڈاک'' کو اردو سے ناواقف لوگوں کے لئے انگریزی میں شائع کیا جائے۔

ملک محمد ناصر

# خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

قارئین ! دیکھنے کا میکانزم یہ ہے کہ آنکھ کے تِل میں پڑنے والا عکس دماغ کی اسکرین پر الٹا ظاہر ہوتا ہے۔ آنکھ نیگیٹو پوزیٹو کی بنیاد پر الٹے کو سیدھا اور سیدھے کو الٹا دیکھ رہی ہے یعنی سر اوپر اور پیر نیچے۔

آفاق کو احساس ہوا کہ اندر میں کوئی بے چین ہے تو چونک گیا کہ میرے اندر میرے علاوہ کوئی رہتا ہے۔ اندر سے لاتعلقی پر حیرت ہوئی۔ کون ہے، کب سے رہ رہا ہے، رنگ روپ کیسا ہے اور کیا اندر میں اتنی گنجائش ہے کہ دوسرا وجود رہ سکے ؟ اس کی کوئی جسامت ہے یا احساس کی شکل میں رہتا ہے اور وہ بے چین کیوں ہے ؟

یکا یک خیال آیا ـــ میں کون ہوں۔

خیال بے رنگ تھا۔ بے رنگی احساس بنی تو رنگ پیدا ہو گئے ۔ اس نے ایک عورت دیکھی جو امید سے تھی اور گھر میں ننھے مہمان کی آمد قریب تھی۔ عورت اینٹ رکھ کر دوسری اینٹ اٹھاتے ہوئے ننھے وجود کے تصور میں کھو گئی۔ تصور میں رنگینی پیدا ہوئی اور رنگوں میں پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔ مہمان علمِ شے سے وجودِ شے کا روپ دھار کر دنیا میں آنے کا منتظر تھا۔

عورت کون ہے ـــ؟ لگتا ہے میری طرح وہ بھی تلاش میں ہے ۔ باہر گھر بنا رہی ہے اور اندر وجود تشکیل کے آخری مراحل میں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تخلیقی عمل سے گزرنے کے باوجود وہ تخلیق کے قانون سے واقف نہیں۔ شاید وہ بھی نہیں جانتی کہ اندر میں کون ہے۔

وہم، خیال، تصور، احساس اور مظہر !

قطرے کا گوہر ہونے تک سفر ۔ قطرہ پھٹکی بنا، پھٹکی سے بوٹی اور لوتھڑا ـــ قطرے کی طرح لوتھڑا خلا ہے ، خلا میں ہڈیوں سے عمارت تعمیر ہوئی۔ رگ پٹھوں کا مسالا بھرا اور قطرہ نئے روپ میں ظاہر ہو گیا۔ بے شک وہ ہستی واحد مطلق ہے جو ماں کے شکم میں کیسی کیسی تصویریں بناتی ہے۔

آفاق کے اندر میں خیال دستک دے رہا تھا۔ خیال کو وہم سمجھ کر جھٹک دیا مگر آواز آئی کہ میں تمہاری اصل ، جو تمہارے اندر مقیّد ہے، مظاہرہ چاہتی ہوں۔ آفاق نے سوچا اصل ظاہر کیسے ہو؟

ماں باپ کی وفات کے بعد چاچا نے آفاق کی پرورش کی ۔ جوان ہوا تو کام کی تلاش میں گاؤں سے نزدیک چھوٹے شہر کی طرف گیا۔ نئے مکانات بن رہے تھے۔ زیر تعمیر دو منزلہ عمارت میں داخل ہوا جہاں مزدور کام میں مصروف تھے۔ ٹھیکے دار نے مختصر بات چیت کے بعد کام پر رکھ لیا۔

اینٹیں اٹھاتے ہوئے بڑے مستری کو بتایا کہ میرے پاس رہائش نہیں ہے ۔ مستری خدا بخش نے مالک مکان سے بات کرنے کو کہا۔ اسے زیر تعمیر مکان کے ایک حصے میں دوسرے مزدوروں کے ساتھ رہنے کی اجازت مل گئی۔ سر چھپانے کا بندوبست ہونے پر اطمینان ہوا۔

آفاق نے مستری خدا بخش کے قریب اینٹیں رکھتے ہوئے کہا، چاچا! تم ایک اینٹ اٹھاتے ہو، بجاتے ہو اور اعتماد کے ساتھ دیوار میں چن دیتے ہو۔ کیسے پتہ چلتا ہے یہ اینٹ اس جگہ لگنی چاہئے؟

خدا بخش کے ہاتھ چند لمحوں کے لئے رکے، آفاق کی طرف دیکھا پھر اینٹ کے ایک طرف مسالا بھر کر دوسری اینٹ چنتے ہوئے کہا، اینٹ اور پتھر مجھ سے باتیں کرتے ہیں۔ ہر ذرّہ باشعور ہے، اپنے مقام، مقصد اور صلاحیت سے واقف ہے۔ ذرّات میں سے فوائد اور صلاحیت کے مطابق لہریں نکلتی ہیں، آگہی کا ذوق رکھنے والوں کے ذہن کی اسکرین پر ظاہر ہوتی ہیں اور خیال خاص مراحل کے تحت مظہر بن جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات ظاہر کرنے کا ارادہ کیا تو کائنات وجود میں آگئی ۔ اللہ تعالیٰ نے جمادات، نباتات اور ساری مخلوقات سے پوچھا کہ بارِ امانت کون اٹھائے گا۔ سب نے معذوری ظاہر کی مگر انسان نے امانت قبول کرلی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ظالم اور جاہل قرار دیا۔ امانت کی وجہ سے انسان کو کائنات کا علم دیا گیا ہے۔ انسان تخلیقات کے خواص سے واقف ہو سکتا ہے، ان سے ہم کلام ہو سکتا ہے اور ان میں تصرف کر سکتا ہے۔

چاچا! کیا تمہیں کائنات کا علم ہے؟

انہوں نے سر آہستہ سے نفی میں ہلایا۔

پھر تم پتھر سے کس طرح باتیں کرتے ہو؟

پتر! جب اینٹ کو دیکھتا ہوں تو اس کا سوال میرے ذہن میں اور میرا سوال اس کے ذہن میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ ہم دونوں کا برسوں کا ساتھ ہے۔

مستری خدا بخش کی ان باتوں سے وہ ان کے قریب ہو گیا۔ یقین تھا وہ بہت کچھ جانتے ہیں مگر زیادہ چھپاتے ہیں۔

ایک شام کھانا کھانے کے بعد آفاق دل کی بات زبان پر لایا کہ میں اپنی اصل کی تلاش میں ہوں جو ہر دم مجھے پکارتی ہے۔ اس تک کس طرح پہنچوں؟

وہ بولے، اصل تمہارے اندر ہے۔

چاچا! اصل میرے اندر ہے اور مجھے معلوم نہیں ہے۔ کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے؟

بس پتر! ایسا ہی ہے۔ تلاش ارادے سے وابستہ ہے اور ہم ارادہ نہیں کرتے۔

۱۔ مالک مکان کے ذہن میں خوب صورت مکان کا تصور تھا۔ انجینئر سے رابطہ کیا۔ اس نے سفید کاغذ لائنوں سے سجا کر نقشہ بنایا۔ کام شروع ہو گیا۔ تمہارے سامنے ہے کہ تعمیر جوں جوں آگے بڑھ رہی ہے، تصور میں رنگینی پیدا ہو رہی ہے۔

۲۔ سنگ تراش کے تصور میں نازنین کا مجسمہ ہے۔ پتھر کا انتخاب کیا اور تراش کر ذہن میں تصویر کو پتھر میں ظاہر کر دیا۔

۳۔ ذہن کے نہاں خانوں میں جو کہانی چھپی ہوئی ہے وہ لکھاری کے قلم کی حرکت سے الفاظ کا روپ دھار کر کاغذ پر منتقل ہو جاتی ہے۔

۴۔ گلوکار کی سانسوں کے زیر و بم میں نغمہ چھپا ہوا ہے جو سانس کی معین مقداروں کے تحت باہر آتا ہے اور سننے والوں کو مدہوش کر دیتا ہے۔

سب باطن کا ظہور اور ارادے کے تابع ہے۔

آفاق بولا، چاچا! میں تھک گیا ہوں۔

نہ پتر! تو تھکا نہیں، تیرا ارادہ کم زور ہے۔ اصل کیوں تجھ پر ظاہر ہو جب تیرے اندر چلنے کا حوصلہ نہیں۔ تو جلد باز اور بے صبرا ہے۔ فوراً نتیجہ چاہتا ہے۔ دیکھ! ہر شے لمحہ بہ لمحہ بدل رہی ہے۔ ماں کے شکم میں بچے کا وجود نہیں ہوتا لیکن دیکھ قدرت کس طرح بچے کو ماں کے شکم میں منتقل کر کے نشوونما کرتی ہے، ہر روز صورت بدلتی ہے اور وہ قطرے سے کیا سے کیا بن جاتا ہے۔

آفاق کو وہ عورت یاد آگئی جو تصور میں آتی تھی اس نے سوچا کہ بچہ دنیا میں آگیا ہو گا۔ چاچا! تم وہ باتیں کیوں کرتے ہو جو میرے اندر ہوتی ہیں؟

جا اینٹوں کو غور سے دیکھ! جواب مل جائے گا۔

آفاق اٹھا اور قریب جا کر دیکھا تو ساری اینٹیں ایک سی تھیں۔ وہ مسکرا دیا اور بولا، چاچا! تم بہت گہرے ہو، سامنے نہیں آتے۔

پتر! کم زور ارادہ، کچی اینٹ ہے جو کبھی بنیاد نہیں بن سکتی۔ اس پر جو عمارت تعمیر کرو گے، گر جائے گی۔ ارادے کی قوت پختہ اینٹ جیسی ہے۔ پختہ اینٹ کی قوت سوا لاکھ کچی اینٹوں سے زیادہ ہے۔ یہی اینٹ بنیاد کا شعور دیتی ہے۔

آفاق نے سوچا کہ مٹی کی کشش نے ہمیں اصل سے دور کر دیا ہے۔ بسا اوقات محسوس ہوتا تھا کہ اصل اور مٹی میں جنگ جاری ہے اور وہ دونوں کے درمیان میں کھڑا ہے۔

چاچا سونے کے لئے اٹھے اور بستر درست کرنے لگے۔ آفاق نے آواز دی، وہ عورت کون ہے جو میرے تصور میں آتی ہے۔ انہوں نے پیچھے دیکھے

بغیر جواب دیا، تغیر ہے۔

اندھیرے میں آدھی کھڑی دیوار کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ چاچا کے جواب نے سوچ کی کھائی میں پھینک دیا تھا۔ وہ عورت تغیر ہے تو تغیر کیا ہے؟

مزدور جلدی سو گئے تھے مگر آفاق کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ اینٹوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے سے پپوٹے بھاری ہونے لگے اور پلکیں غلاف بن گئیں۔ نیند کی دنیا میں ہر طرف رنگ تھے اور رنگ روپ در روپ تھے۔ ہر روپ دل نشین تھا۔ روپ ذرّات میں تحلیل ہونے سے رنگ غائب ہو گئے ۔ ذرّات یکجا ہوئے تو رنگ دوبارہ ظاہر ہو گئے اور وہ دم بخود رہ گیا۔ ذرّات نے اس عورت کی شکل اختیار کر لی تھی جسے تصور میں دیکھا تھا۔ پوچھنا چاہتا تھا کہ تم کون ہو لیکن مہلت نہیں ملی اور وجود بکھر کر دوبارہ ذرّات میں تقسیم* ہو گیا۔

ٹَک ٹَک کی آواز سے آنکھ کھلی۔ صبح ہو چکی تھی۔ مزدور کام کر رہے تھے۔

دن بھر مستری خدا بخش سے بات نہیں ہو سکی۔ شام کو شہر سے باہر کچی آبادی کی طرف نکل آیا۔ یہ اینٹیں بنانے والوں کی بستی تھی جہاں عورت مرد دونوں کام کر رہے تھے۔ سامنے سے ایک عورت گود میں سات آٹھ مہینے کے بچے کو اٹھائے آ رہی تھی۔ رات دیکھنے والا خواب بیدار ہوا اور یک لخت نظر کا زاویہ بدل گیا۔ آفاق نے دیکھا کہ بچے سے لے کر چھوٹے بڑے قد کاٹھ کے مرد عورت سب تغیر کے روپ ہیں۔ نظر نہ آنے والا ایک وجود کتنے وجود میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ سب ایک روپ کا تغیر ہے یعنی اپنی ابتدا سے دوری ہے۔

آفاق اس نتیجے پر پہنچا کہ تغیر —— اصل سے دوری ہے۔ مستری خدا بخش نے کہا تھا کہ ”تصور میں آنے والی عورت تغیر ہے“۔ وہ تغیر ہو کر ایک اور تغیر کی تخلیق کا ذریعہ بن رہی تھی۔ اصل سے دور ہونے کا مظاہرہ خواب میں دیکھ لیا تھا کہ ذرّات یکجا ہوئے تو جسم بنا اور جسم بکھرا تو ذرّات میں جسم کا نام و نشان نظر نہیں آیا۔ نظر اپنے وجود پر پڑی تو سوالوں کے جواب مل گئے کہ میرا جسم بھی ذرّات سے بنا ہے اور ذرّات کے بکھرنے سے پہلے مجھے اصل کی طرف لوٹنا ہے۔ یہ سوچ کر وہ بستی سے نکل آیا۔ چاچا راہ تک رہے تھے۔ دیکھ کر مسکرا دیئے۔ اس نے کچھ نہیں بتایا کیوں کہ یہ مسکراہٹ بے وجہ نہیں تھی۔ مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ جانتے ہیں۔ چاچا کون تھے ——؟ اندر میں تصویر نظر آئی۔ وہ تصویر چاچا کی تھی۔

قارئین! اب مضمون دوبارہ پڑھئے۔

آپ کیا سمجھے —— لکھئے، شکریہ۔

* تقسیم ہو گیا (بکھر گیا)

شاہد احمد (عجمان)

# ٹیلی فون کا نوعی ریکارڈ

م ض م و ن ـــــ مضمون نگار خواتین و حضرات اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ (ایڈیٹر)

آدم نے پہلے روز سے معاشی اور معاشرتی زندگی کو آرام دہ اور پُر سکون بنانے کے طریقے تلاش کئے۔ وقت گزرا، دور بدلا۔ ہر دور میں موجد نے اسلاف کی ایجادات سے ایک قدم آگے غور و فکر کی کوشش کی، نئی جہتیں اور نئے افق تلاش کئے۔

موجودہ دور کی اہم ایجادات میں سے ایک ٹیلی فون ہے۔ محقق کو رابطے میں آسانی پیدا کرنے کا خیال آیا تو اس نے ٹیلی فون ایجاد کیا۔ دوسرے محقق نے اس ایجاد میں غور و فکر کر کے دنیا کو موبائل فون سے متعارف کروایا۔ تیسرے محقق نے موبائل فون میں مزید تفکر کر کے اسمارٹ فون پیش کیا اور فون کی پہلی شکل کو ایک طرح سے ماضی بنا دیا۔ ہو سکتا ہے مستقبل میں کوئی محقق اس ایجاد (اسمارٹ فون) کو تبدیل کر کے نئی ٹیکنالوجی بنالے اور اسمارٹ فون کو پیچھے چھوڑ دے۔

غور طلب ہے:

۱۔ پہلے موجد کو اسمارٹ فون کا خیال کیوں نہیں آیا؟

۲۔ ذہن کی وہ کون سی صلاحیت ہے جو ایک موجد کو نظر آتی ہے اور دوسرے کو نظر نہیں آتی؟

۳۔ دیکھنے کے عمل میں وہ کون سا راز ہے جو لاکھوں آدمیوں میں سے ایک آدمی کے حصے میں آتا ہے اور سب اس کی ایجاد کے گرویدہ ہو جاتے ہیں؟

دیکھنے کے لئے عمومی طور پر مختلف زبانوں میں جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں، ان کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شے مادی خدوخال کے ساتھ موجود ہے۔ اس کے علاوہ دیکھنے کی کئی طرزیں ہیں جیسے خواب میں دیکھنا، خیال میں دیکھنا، تصور میں دیکھنا، غور و فکر کرتے ہوئے دیکھنا، بند آنکھوں سے دیکھنا اور دل میں دیکھنا وغیرہ۔

روحانیت اور سائنس کے طالب علموں کے لئے قابلِ غور ہے کہ دیکھنے اور سمجھنے کی ساری طرزیں خیال سے شروع ہوتی ہیں۔ خیال کی آمد کے بعد فرد جن مراحل سے گزرتا ہے ان میں تصور، احساس، اچھے اور برے کی کسوٹی، عمل کا ارادہ اور ارادے کی تکمیل کی طرف پیش قدمی شامل ہیں۔

خیالات ترتیب سے آتے ہیں اور دماغ کی اسکرین پر تصویر بنتے ہیں۔ ہر خیال فلم کی طرح نشر ہوتا ہے کہ آن میں ایک دنیا سامنے آجاتی ہے۔ چاہے وہ دنیا زمین کی ہو یا آسمان سے وابستہ، دیگر سیاروں کا نقش ہو یا جنت دوزخ کا مشاہدہ، خیال میں سب موجود ہے۔ مثلاً کسی ترقی یافتہ ملک کا خیال آئے تو خیال کے ساتھ اس ملک کے شہر، علاقے، شاہراہیں، مکانات، افراد، اشیا، ٹیکنالوجی، رہن سہن، احساسات، جذبات، تعلیمی نظام وغیرہ کی تصویر ذہن کی اسکرین پر آجاتی ہے۔

دوسری مثال سیاروں کی ہے۔ سیاروں کی دنیا ہم نے نہیں دیکھی۔ ہم چاہیں تو کھربوں سیاروں کو تصور میں یک نگاہ دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب ہم لفظ لامحدود کہتے ہیں تو لامحدود کا بھی نقشہ بن جاتا ہے جب کہ وہ نقشہ حقیقی نہیں ہوتا۔

اہم بات ہے کہ خیال وارد ہوتے ہی دماغ کی اسکرین پر گنتی سے زیادہ اشیا منعکس ہوتی ہیں مگر خیال کی وسعت کا دامن تنگ نہیں ہوتا۔ بتانا یہ ہے کہ قدرت نے ہمیں محسوس کرنے کی اعلیٰ صلاحیت سے نوازا ہے۔

موبائل فون کے پہلے موجد نے اطلاع کو جس شکل میں وصول کیا وہ فون کی سادہ شکل تھی۔ وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس دور کے موجد کے پیش نظر صرف ایسی ڈیوائس کی ایجاد تھی جو لہروں کے ذریعے آواز کو زمین کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچادے۔ اس نے خیال کو انہی حدود میں تلاش کیا اور نتیجہ عوام کے سامنے پیش کردیا۔ موجد کے ذہن میں آواز پہنچانا مقصود تھا لہٰذا غور و فکر نے ذہن کو مقصد کے مطابق منور کیا۔ بعد کے محقق نے سوچا کہ فون ایسا ہونا چاہئے جو تار کے بغیر ہو اور چلتے پھرتے استعمال کیا جائے۔ موبائل فون ایجاد ہوگیا۔ کچھ عرصہ گزرا تو تحقیق کرنے والوں کے ذہن میں جھماکا ہوا کہ جب لہروں کے ذریعے آواز ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہوسکتی ہے تو تصویر بھی منتقل کی جاسکتی ہے۔ تصور میں وسعت پیدا ہوئی یعنی شبیہ بن گئی اور اسمارٹ فون ایجاد ہوا۔ یوں کہیں کہ سب نے اطلاعات کے ذخیرے سے مطلوبہ اہداف حاصل کئے اور ایجاد کی شکل بدلتی رہی۔

دیکھنے کی صلاحیت درجہ بدرجہ روشن ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ روشنی ہم کس طرح اور کہاں سے حاصل کریں؟



آدم کی فضیلت ''علم الاسماء'' سے ہے۔ نافرمانی کی وجہ سے جنت سے نکلنے کے بعد ''اسماء'' کا علم پردے میں چلا گیا اور وہ نظر غالب ہوگئی جو خود حجاب ہے۔ حجاب کے آگے جو منظر یا شے آتی ہے وہ حجاب بن جاتی ہے۔

مشاہدہ: دھند چھاتی ہے تو منظر غائب نہیں ہوتا بلکہ دھند منظر میں سرایت کر جاتی ہے جس کے تدارک کے لئے ماہرین نے مختلف طریقے ایجاد کئے ہیں۔ جیسے رات میں دیکھنے کے لئے نائٹ وژن چشمے اور دھند کے دوران طیارے کی لینڈنگ کے لئے ایکسٹرا ہیوی لائٹ۔

باطنی ماہرین کے مطابق ذہن عمل کے ذریعے روشنی حاصل کرتا ہے۔ خلوص، قوت ارادی، ثابت قدمی اور غوروفکر کی صفات روشنی کو ذخیرہ کرنے کی استعداد بڑھاتی ہیں۔

اس بات کو ایک اور زاویے سے سمجھیں۔

کتابوں میں پڑھا ہے کہ محقق تفکر کے دوران کھانا پینا بھول جاتے ہیں۔ تفکر میں اس قدر منہمک ہوتے ہیں کہ ذہن آواز کی طرف نہیں جاتا۔ دراصل ہر مفکر خیال کو بہترین حالت میں قبول کرنے کے لئے ماحول ترک کرتا ہے۔ پہلا ترک اردگرد موجود آوازوں، مناظر اور افراد سے بے نیاز ہونا ہے۔ بے نیازی سے اندر میں روشنی دیکھنے کی صلاحیت بیدار ہوتی ہے۔ مناظر روشنی کی تخلیق ہیں اس لئے ذہن جس حد تک روشنی دیکھتا ہے اس کے مطابق مناظر روشن ہوتے ہیں۔

حکمِ الٰہی کے تحت قانون فطرت بلا امتیاز حرکت میں ہے۔ ایجادات معاشی اور معاشرتی تقاضوں کی تکمیل میں آسانی کے لئے کی جاتی ہیں، ہدف تک پہنچنے کے لئے مختلف راستوں سے گزرنا پڑتا ہے، جو وقت تحقیق میں صرف ہوتا ہے وہ دیگر کاموں میں بھی ہو سکتا ہے مگر محقق کی ترجیح وقت ضائع کرنا نہیں، وہ نفع نقصان سے بالاتر ہو کر مال خرچ کرتا ہے، کچھ عرصے کے لئے رشتے اور تعلقات کو ترک کرتا ہے لیکن اپنے مقصد پر قائم رہتا ہے۔ وقت کا ایثار، توکل (نفع نقصان سے بالاتر ہونا)، اجتماعیت (اجتماعی مفاد کے لئے مال کا خرچ)، صبر اور استقامت جیسی خصوصیات ذہن کے نہاں خانے روشن کرتی ہیں۔

ماں باپ اولاد کے لئے اپنا آرام اور خواہشات ترک کر کے تربیت کرتے ہیں تو بچے امن پسند، با اخلاق اور ذمہ دار شہری بنتے ہیں۔ ایثار ہم سب کی بقا کا ضامن ہے۔ جب یہ ترک ملک و قوم کی ترقی کے لئے ہوتا ہے تو خوش حالی آتی ہے اور اجتماعی مفاد کے لئے ایثار کرنے والا معاشرے میں ممتاز فرد ہے۔

دنیا دارالعمل ہے۔ روح ہماری نافرمانی کے باعث مادی جسم کے ساتھ اسفل سافلین میں رہنے پر مجبور ہے۔ ہم روح سے واقفیت نہ رکھنے کی وجہ سے تقاضوں کی تسکین کی ابتدا بشری تقاضوں سے کرتے ہیں اور روح تشنہ رہتی ہے۔ روح کا تقاضا ہے کہ اسے خالقِ کائنات کا قرب حاصل ہو۔

صبر، شکر، فرماں برداری، بردباری، یقین کی پاسداری اور غور و فکر رحمانی طرزیں ہیں جن سے باطن میں نور ذخیرہ ہوتا ہے اور نور، نظر بن جاتا ہے۔ خیال اور عمل کے درمیان ایک فلٹر ہے جس کا کام فرد کو رحمانی طرزوں کی طرف راغب کرنا اور روحانی بالیدگی پیدا کرنا ہے۔

ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاؒ فرماتے ہیں:

”عام حالات میں ہر انسان کو یہ کیفیت حاصل ہے انسان اس کیفیت کو اپنی زبان میں ضمیر کے نام سے پہچانتا ہے۔ وہ ضمیر کی آواز سنتا ہے اور اس آواز کی راہ نمائی میں نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ فی الواقع یہ قدرت کی آواز ہوتی ہے اور قدرت کا بخشا ہوا نتیجہ ہوتا ہے۔ نتیجہ انسان کی ذات تک پہنچتا ہے۔ یہیں سے نفس کی تنقید شروع ہوتی ہے۔ یہ تنقید انسان کی نیت کو صحیح رکھتی یا غلط کر دیتی ہے۔ قرآن پاک میں نفس کی اس ہی تنقید کو رویت اور نظر کا نام دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ○
(الاعراف:۱۹۸)

اور تو دیکھ رہا ہے کہ تیری طرف دیکھ رہے ہیں اگرچہ وہ نہیں دیکھ رہے۔

اس آیت میں چار ایجنسیوں کا تذکرہ ہے۔ نفس کی دو ایجنسیوں کا نام رویت اور نظر لیا گیا ہے۔ نیز لَا يُبْصِرُوْنَ میں الٰہی سماعت اور بصارت کی دونوں ہی ایجنسیاں مدغم ہیں۔ جب تک انسان اندرونی آواز پر توجہ نہیں دیتا، راہ نمائی حاصل نہیں کر سکتا۔“ (کتاب: لوح و قلم)

آدمی اندر کی آواز پر توجہ نہ دینے کی وجہ سے خسارے میں ہے۔ 1400 سال پہلے جب دنیا کی آبادی کم اور زندگی مجموعی طور پر سادہ تھی، قرآن کریم میں آیت نازل ہوئی کہ

”قسم ہے زمانہ کی، بے شک انسان خسارے میں ہے۔“ (العصر:۱۔۲)

آج سات ارب سے زائد آبادی اور وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم سے ذہن پر گرد کی دبیز تہیں جم گئی ہیں جو اندھیرے کے علاوہ کچھ دیکھنے نہیں دیتیں۔ سوچ کو نور کی جگہ ظلمت (اندھیرا) نظر آتی ہے جس کے باعث ہم شکوک و شبہات کی زندگی سے دوچار اور خسارے میں ہیں۔ سکون روح کا عرفان ہے اور ظلمت بے سکونی ہے۔

مضمون کی ابتدا میں سوال تھا کہ پہلے محقق کو اسمارٹ فون بنانے کا خیال کیوں نہیں آیا۔ میری دانست میں فون بھی ایک نوع ہے۔ جب محقق کو فون بنانے کا خیال آیا تو اس خیال میں فون کی پوری نوع کا ریکارڈ تھا۔ وہ اپنے ذہن کی وسعت کے مطابق خیال کے ایک درجے سے واقف ہوا۔

جس طرح گلاب میں گلاب کی پوری نوع کا

ریکارڈ ہے، فون کے خیال میں فون کی پوری نوع موجود ہے۔ فون کی جتنی صورتیں ہو سکتی ہیں، وہ سب پہلے محقق کے خیال میں ریکارڈ تھیں۔ بعد میں آنے والے ہر محقق کے ساتھ بھی یہی صورت رہی۔ چوں کہ محقق کسی نہ کسی حد تک محدودیت کے تابع تھے اس لئے انہوں نے خیال کی کوئی ایک جہت قبول کی۔

اس کے برعکس روحانی انسان جب کسی شے کو دیکھتا ہے تو اس شے میں پوری نوع کا ریکارڈ دیکھ لیتا ہے اس لئے جب وہ انسانیت کی فلاح کا پروگرام ترتیب دیتا ہے تو یہ پروگرام سینکڑوں سال کی منصوبہ بندی پر مشتمل ہوتا ہے۔

محترم عظیمی صاحب فرماتے ہیں:

"انسان کم از کم پانچ سو سال کی منصوبہ بندی کرتا ہے۔"

خیال رہے کہ آدمی اور انسان میں فرق ہے۔ انسان کا بنایا ہوا پروگرام کم سے کم پانچ سو سال کا ہوتا ہے، زیادہ کی کوئی حد نہیں۔

واضح ہوتا ہے کہ ذہن رحمانی طرزوں سے آشنا ہو جائے تو نگاہ میں ہزاروں سال کے واقعات دیکھنے کی سکت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے شخص کو جو خیال آتا ہے، وہ اس خیال میں موجود ساری جہتیں اور نوعی ریکارڈ دیکھ لیتا ہے۔

کچھ نہ سنو تو بہتر ہے

ناصرؔ کیا کہتا پھرتا ہے
کچھ نہ سنو تو بہتر ہے
دیوانہ ہے دیوانے کے
منہ نہ لگو تو بہتر ہے

کل جو تھا وہ آج نہیں
جو آج ہے کل مٹ جائے گا
روکھی سوکھی جو مل جائے
شکر کرو تو بہتر ہے

کل یہ تاب و تواں نہ رہے گی
ٹھنڈا ہو جائے گا لہو
نامِ خدا* ہو جوان ابھی
کچھ کر گزرو تو بہتر ہے

کیا جانے کیا رت بدلے
حالات کا کوئی ٹھیک نہیں
اب کے سفر میں تم بھی
ہمارے ساتھ چلو تو بہتر ہے

کپڑے بدل کر بال بنا کر
کہاں چلے ہو کس کے لیے
رات بہت کالی ہے ناصرؔ
گھر میں رہو تو بہتر ہے

(کلام: ناصر کاظمیؔ)

**********

*نامِ خدا (چشمِ بد دور، خدا کی قسم)

زیرِ سرپرستی

اللہ کے دوست حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی

# عظیمیہ روحانی لائبریری

برائے خواتین

روحانی علوم کے متلاشی خواتین و حضرات، راہِ سلوک کے مسافر اور روحانی سائنس میں دلچسپی رکھنے والے طالبات و طلبہ کے لئے عظیمی صاحب کی کُتب اور تصوف کی دیگر کتابیں مطالعہ کے لئے موجود ہیں۔

مکان نمبر 65 بلاک A-2، پنجاب ہاؤسنگ سوسائٹی

نزد جوہر ٹاؤن، لاہور۔ فون نمبر: 042-35185142

# زندگی ایک نہیں ـــــ دو ہیں؟

برخوردار! ذہن نشین کرلو کہ یہاں کوئی نہیں سیکھتا، جو کچھ ہوتا ہے، منتقل ہوتا ہے اور منتقلی کے لئے ذہن تیار کیا جاتا ہے۔ کائنات کا نظام منتقلی کے میکانزم پر قائم ہے اور اس کی مثال خیال ہے۔ ہر کام خیال کے تحت ہے اور خیال لاشعور سے منتقل ہوتا ہے۔

نوجوان نے درویش سے پوچھا، زندگی کیا ہے؟

درویش نے فرمایا، سادہ تعریف میں حواس ہے۔

عرض کیا، کیا زندگی کی پیچیدہ تعریف بھی ہے؟

درویش نے فرمایا، پیچیدہ تعریف حواس ہے۔

نوجوان نے تعجب سے پوچھا کہ سادہ اور پیچیدہ جواب ایک کیسے ہو سکتا ہے؟

درویش نے فرمایا، کیوں نہیں ہو سکتا۔ یہاں ہر شے دو رخ ہے۔ حواس کے بھی دو رخ ہیں۔ ایک سادہ اور دوسرا پیچیدہ۔ زندگی کو حواس سے الگ کیا نام دو گے؟ حواس کا مظاہرہ نہیں ہوتا تو بے جان سمجھتے ہو، مظاہرہ ہو جاتا ہے تو جان دار کہتے ہو۔ حواس محض سننا، دیکھنا، سمجھنا، محسوس کرنا اور بولنا نہیں، موجودگی خود اپنی ذات میں حس ہے اور اس تعریف کے مطابق کوئی شے بے جان نہیں۔

نوجوان نے عرض کیا، ایک شے کی دو تعریفیں کیسے ہو سکتی ہیں، دو سے تو ابہام پیدا ہوتا ہے؟

درویش نے فرمایا، کیا ہی اچھا ہو کہ جو تم نے کہا، وہ تمہارے اندر اتر جائے۔

نوجوان نے احتراماً عرض کیا، آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں اپنے قول سے واقف نہیں جب کہ یہ میں نے ہی کہا ہے۔ کہیں یہ تو نہیں کہنا چاہتے کہ زبان میری اور الفاظ کسی اور کے ہیں؟

درویش نے فرمایا، میں کیا کہوں؟ سوال پوچھتے ہو اور جواب بھی خود دیتے ہو اور دوبارہ سوال پوچھ لیتے ہو۔ یہ جواب سے لاعلمی ہے۔

نوجوان نے کچھ دیر ٹھہر کر اب تک ہونے والی گفتگو کو ابتدا سے ذہن میں دہرایا۔

قارئین! بات سمجھنے کے لئے جتنی دیر تک یہ نوجوان درویش سے ہونے والی گفتگو ذہن میں دہرا رہا ہے، اس دوران آپ بھی مضمون ابتدا سے پڑھئے اور بتایئے کہ درویش نے یہ جملہ کیوں کہا؟

پانچ منٹ گزر گئے۔

ہاں بھئی برخوردار! تم ٹھیک کہتے ہو کہ ایک شے کی دو تعریفیں نہیں ہو سکتیں۔

نوجوان نے عرض کیا، پھر زندگی کی دو تعریفیں زندگی سے متعلق ابہام پیدا کریں گی۔

فرمایا، ضرور ایسا ہی ہے اور تم ابہام کا شکار ہو۔ میں نے جو کہا تمہارے مشاہدے کے مطابق کہا۔ زندگی تو زندگی ہے —— اگر اپنی علامات ظاہر نہیں کرتی تو تم اسے موت کا نام دیتے ہو۔ کیوں نہیں سوچتے کہ یہاں خاموش ہو کر وہ کہیں اور بول رہی ہے۔ ابہام میں نے پیدا کیا یا تم نے؟

محترم! یہاں مرنے والا کہیں اور کس طرح بول رہا ہے؟ وہ مر چکا ہے۔

درویش نے پوچھا، کبھی تصور یا خواب میں اس دنیا سے جانے والے رشتہ داروں کو کھاتے پیتے، چلتے پھرتے اور باتیں کرتے ہوئے نہیں دیکھا؟ ان میں سے کوئی تمہارے پاس آتا ہے اور اپنی کیفیت بیان کر جاتا ہے۔ یہ سب زندگی کے آثار ہیں۔ وہ کہاں پر ہے، کیا کھا رہا ہے، کیسے کھا رہا ہے، اس کے رزق کا انتظام کس نے کیا، وہ پریشان یا خوش کیوں ہے؟ یہ پیغام ہے کہ اس دنیا کی طرح کسی اور مقام پر ایک دنیا آباد ہے، یہاں سے جانے والا وہاں پر اِس دنیا کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔ موت کو تم نے مرنا سمجھ لیا ہے جب کہ موت —— منتقل ہونا ہے۔ دیگر تقاضوں کی طرح اس عالم سے دوسرے عالم میں منتقل ہونا بھی زندگی کا تقاضا ہے۔

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

موت زندگی کے ذوق و میلان کو از سر نو انجام دینے کا عمل ہے۔ آدمی ہر وقت مر رہا ہے مگر مرنے والا نظر نہیں آتا۔ دو دن کی موت کے درمیان ایک زندگی ہے جو تغیر ہے۔ جب زندگی کا ایک مظہر (پرت) بے حرکت ہوتا ہے تو دوسرا پرت متحرک ہو جاتا ہے۔ یہ نظام مخلوق کی شعوری سکت کے مطابق قائم کیا گیا ہے۔

نوجوان نے اعتراف کیا، آپ نے حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔

درویش نے فرمایا، بیٹا! حقیقت سے پردہ اس وقت تک نہیں اٹھتا، جب تک ذہن سے نہ اٹھے۔

نوجوان کے دل میں درویش کے رعب کی لہروں کا دباؤ بڑھ گیا۔ بات بہت گہری تھی۔

محترم! علم و حکمت کے موتی کیسے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ علم و ہنر آپ نے کہاں سے سیکھا؟

برخوردار! ذہن نشین کر لو کہ یہاں کوئی نہیں سیکھتا، جو کچھ ہوتا ہے، منتقل ہوتا ہے اور منتقلی کے لئے ذہن تیار کیا جاتا ہے۔ کائنات کا نظام منتقلی کے میکانزم پر قائم ہے اور اس کی مثال خیال ہے۔ ہر کام خیال کے تحت ہے اور خیال لاشعور سے منتقل

ہوتا ہے۔ رہا تمہارا سوال تو یہ باتیں میرے ذہن میں ”الست بربکم“ کے قانون پر تفکر سے منتقل ہوئیں۔ ظاہری و باطنی جتنے قوانین ہیں، سب کے راز وہیں سے ملتے ہیں اور وہیں پر کھلتے ہیں۔

نوجوان کو یاد آیا کہ اس نے زندگی کی تعریف پوچھی تھی، جواب میں بتایا گیا کہ زندگی کی سادہ و پیچیدہ تعریف حواس ہے۔ وہ وضاحت چاہتا تھا۔

عرض کیا کہ گفتگو جس سوال سے شروع ہوئی تھی، اگر اس کا جواب مل جائے تو میرا خیال ہے کہ پوری گفتگو کا خلاصہ ہو جائے گا۔

درویش نے نوجوان کی ذہانت پر زیر لب مسکراتے ہوئے فرمایا ، ٹھیک کہتے ہو۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم کیا سمجھے، حواس کیا ہیں؟

عرض کیا، محسوس کرنے یا کام کو انجام دینے کی صلاحیت کو حواس کہتے ہیں۔

پوچھا، حواس کی کتنی طرزوں سے واقف ہو؟

بتایا کہ پانچ طرزوں سے واقف ہوں۔ سننا، دیکھنا، سمجھنا، محسوس کرنا اور بولنا۔

ٹھیک ہے۔ کتنی دور کی بات سن لیتے ہو، کتنا دور دیکھ سکتے ہو، محسوسیت کا کیا عالم ہے، تصور کی وسعت کتنی ہے اور کیا الفاظ ادا کئے بغیر مخاطب کو بات سمجھا سکتے ہو؟ کیا فون کے بغیر تمہاری آواز دوسرے شہر یا ملک پہنچ سکتی ہے؟

نوجوان کو سوال کی نوعیت کا اندازہ ہوا۔

عرض کیا، دروازہ بند ہو تو دوسرے کمرے میں موجود فرد کی بات نہیں سنتا۔ دیوار، پردہ یا نظر کے سامنے بال آجائے تو اس سے آگے نہیں دیکھ سکتا۔ تصور میں دنیا جہاں کی سیر کرتا ہوں مگر معلوم نہیں ہے کہ جو کچھ دیکھتا ہوں وہ حقیقت ہے یا سنی سنائی باتوں سے اخذ شدہ مفہوم کی تصویر۔ جہاں تک گفتگو کی بات ہے تو مخاطب تاثرات سے میرے جذبات جان لیتا ہے لیکن پوری بات بیان کرنے کے لئے الفاظ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

درویش نے گہرا سانس لیتے ہوئے فرمایا، پھر تم حواس کی پانچ نہیں، ایک ہی طرز سے واقف ہو جس کو محدودیت کہتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ حواس کی پیچیدہ طرز ہے کیوں کہ اس سے زندگی الجھ گئی ہے اور انتشار پیدا ہو گیا ہے۔ تمہارے پاس تصور کی صلاحیت ہے جو دنیا جہاں کی سیر کرواتی ہے مگر اس طاقت کو تم سننے، دیکھنے اور بولنے میں استعمال نہیں کرتے۔ کتنے مجبور ہو کہ تصور میں ملک ملک گھوم لیتے ہو مگر جسم جس مقام پر ہے، وہاں قید رہتا ہے۔

زندگی کی سادہ تعریف نیند کی دنیا ہے جس میں تم مشقت سے آزاد ہو۔ بیداری کی طرح وقت اور

فاصلے کی قید نہیں۔ جس مقام پر تمہارا ذکر ہوتا ہے نام سنتے ہی پہنچ جاتے ہو۔ میں نے اس کو سادہ تعریف اس لئے کہا کہ اس میں سارے کام ذہن کی طاقت سے انجام پاتے ہیں ۔ اس میں تقسیم، تغیر، انتشار اور رکاوٹ نہیں ہے۔

عرض کیا، یہ تو وہی بات ہوگئی دو تعریفوں والی۔

فرمایا، اس کا جواب بھی ہے۔ پاک اور بلند مرتبہ ذات کا فرمان ہے،

"اور ہر شے کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں تاکہ تم اس سے سبق لو۔" (الذٰریٰت:۴۹)

محدود ذہن کے سمجھنے کا انداز یہ ہے کہ پورا جملہ نہیں پڑھتے اور سیاق و سباق سے ہٹ کر معنی پہناتے ہیں۔ بے شک اللہ نے ہر شے جوڑے اور جوڑے دہرے تخلیق کی ہے ۔ اس قانون میں ہر شے کا لفظ بہت اہم ہے۔ ایک شے کے دو رخ یعنی شے ایک ہے۔ دونوں رخ الگ نہیں ہیں، ان کے ملنے سے شے مکمل ہوتی ہے۔ جن حواس کو میں نے سادہ اور پیچیدہ کہا، کیا وہ ایک نہیں ؟ جسے علم ہے، اس کے لئے سادہ ہیں اور جسے علم نہیں، زندگی اس کے لئے پیچیدہ ہے۔

پوچھا، پھر جوڑے جوڑے کی وجہ کیا ہے؟

فرمایا، نظام جاری رکھنے کے لئے دو رخ کا قانون ہے اور اللہ نے حقیقت بیان کر دی ہے کہ "ہم نے ہر شے جوڑے جوڑے تخلیق کی ہے۔"

تم زندگی اور موت کو نہیں، دونوں میں حرکت کو دیکھو۔ دن اور رات میں الجھنے کے بجائے ان میں وہ روشنی تلاش کرو جو ایک کو دن اور دوسرے کو رات بناتی ہے ۔ مرد اور عورت میں کشش اور گریز کے نظام پر غور کرو۔ پیدائش، بچپن، لڑکپن، جوانی، بڑھاپا اور موت میں مشترک قدر ڈھونڈو۔ نیند اور بیداری کی دنیا کو سمجھو۔ خیال میں حواس کی لامحدودیت اور مظاہرے میں حواس کی محدودیت پر غور کرو۔ ان سب میں وہ نکتہ تلاش کرو جو ایک ہے اور اس ایک کو مضبوطی سے تھام لو پھر تمہیں دنیا کی کوئی بات دھوکا نہیں دے گی۔

نوجوان نے احترام سے سر جھکایا اور دل پر ہاتھ رکھ کر شکریہ ادا کیا۔ درویش نے نوجوان کی پیشانی پر پھونک ماری اور آنکھیں بند کر لیں۔

---

عزیز طالبات اور طلبا سے درخواست ہے کہ اس مضمون کو ذہنی یکسوئی کے ساتھ پڑھیں اور جو بات سمجھ میں نہ آئے اس پر پنسل کا نشان لگا دیں۔ جتنے نشانات مضمون میں لگائے ہیں، ان پر تفکر کریں اور ادارے کو بھیج دیں ۔ انشاءاللہ ! ادارہ آپ کے ساتھ تعاون کرے گا۔

دعاگو

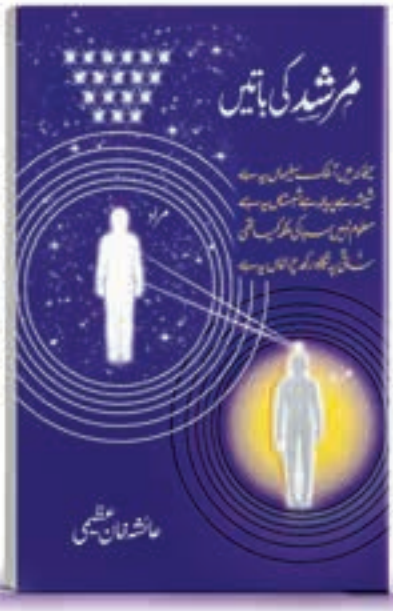


ترتیب وتدوین: عائشہ خان عظیمی

''ماہنامہ قلندر شعور'' میں شائع ہونے والا مقبول و معروف سلسلہ'' مرشد کی باتیں '' کتابی صورت میں شائع کیا جارہا ہے۔

ملنے کا پتہ :

عظیمی

عظیمی یونیورسٹی پریس

AZEEMI UNIVERSITY PRESS

B-123, Azeemi Mohalla, Sector 4-C, Surjani Town, Karachi, Pakistan.
Tel: +92-21-36914040, Cell: +92-346-8553904

خواجہ شمس الدین عظیمی

# پیراسائیکالوجی سے مسائل کا حل

پیراسائیکالوجی کے تحت دیئے گئے علاج کے لئے اجازت ضروری ہے۔ کوئی صاحب یا صاحبہ اجازت کے بغیر علاج نہ کریں۔ (ادارہ)

## یقین

**علیزے جہانگیر (امریکا):** آر کیالوجسٹ ہوں۔ تین سال سے Cluster headache کی شکایت ہے۔ یہ نیورولوجیکل ڈس آرڈر ہے جس میں متواتر درد کی شدید لہر اٹھتی ہے اور اثر آنکھ تک پھیلتا ہے۔ اس دوران آنکھ میں سوجن رہتی ہے، ناک بند ہوتی ہے اور آنکھوں سے پانی بہتا ہے۔ علامات 15 منٹ سے تین گھنٹے تک رہتی ہیں۔ جن لوگوں کو یہ بیماری ہے انہیں دو مہینے درد رہنے کے بعد ایک مہینہ درد نہیں ہوتا لیکن مجھے آرام نہیں ملا۔ دن رات میں کسی بھی وقت اٹیک ہوتا ہے، کبھی چار سے پانچ اور کبھی سات سے آٹھ مرتبہ۔ بیماری کا معروف نام suicide headache ہے۔ اس کا علاج دریافت نہیں ہوا۔

**جواب:** آدمی یقین کی بنیاد پر زندہ رہتا ہے۔ یقین متاثر ہوتا ہے تو زندگی بھی متاثر ہوتی ہے۔ یقین کی دنیا روشن ہونے سے آدمی illusion اور بیماریوں سے دور ہوتا ہے، اللہ کے قریب ہو جاتا ہے اور اللہ کے فضل سے بیماری ختم ہو جاتی ہے۔

صبح نہار منہ اور رات کو سونے سے پہلے ایک مٹھی گندم کی بھوسی کو اچھی طرح پانی میں جوش دیجئے۔ اس میں سے ایک کپ پانی علیحدہ کر کے چھان لیجئے۔ ہلکا نمک اور کالی مرچ ڈال کر پیجئے۔ باقی رہ جانے والے محلول سے بھپارا لیجئے۔ پسینہ آئے گا۔ ہوا سے بچئے اور منہ لپیٹ کر سو جایئے۔

ایک نیند لینے کے بعد آدھی رات کو آرام دہ جگہ پر بیٹھ جایئے جہاں آسانی سے ستارے دیکھ سکیں۔ گیارہ (11) مرتبہ درود شریف پڑھنے کے بعد چمکتے ستارے گنئے اور جتنے ستارے گن سکیں، کاپی میں لکھ لیجئے۔ گھڑی میں alarm سیٹ کر کے یہ عمل روزانہ دس (10) منٹ کرنا ہے۔ ستاروں کی تعداد گنتے وقت گزشتہ روز کا ریکارڈ نہیں دیکھنا۔ عمل کو چالیس (40) دن پورے ہو جائیں، اب شمار کیجئے کہ کتنا فرق ہوا۔ گنتی میں کمی یا زیادتی ہوئی یا

ستاروں کی گنتی برابر تھی؟

### والدین متوجہ ہوں

**د۔ک:** مشترکہ خاندانی نظام میں رہتے ہیں۔ گھر میں چیخ پکار اور جنگ کا ماحول ہے۔ ہم میاں بیوی نہیں لڑتے لیکن بچے آپس میں بہت لڑتے ہیں۔ ایک منٹ مل جل کر نہیں بیٹھتے۔ حد سے زیادہ نافرمان ہیں۔ دوسروں کو ہمدرد سمجھتے ہیں اور ان کی بات فوراً مان لیتے ہیں۔

**جواب:** برائے مہربانی توجہ فرمایئے کہ بچوں کی ماں اور بچوں کے باپ کا رویہ کیسا ہے۔ آپس میں ذہنی ہم آہنگی کتنی ہے۔ ماں باپ ذہنی الجھن اور فکر مندی سے آزاد ہو کر گھر میں ہنسی خوشی رہیں اور دوستانہ ماحول رکھیں۔ بچوں سے زیادہ والدین کو علاج کی ضرورت ہے۔

### صفائی

**ب۔ر (کراچی):** آپ نے جو علاج بتایا تھا اس سے غصہ اور خوف کم ہوا۔ ذہن آزاد محسوس ہوتا ہے۔ ذہن میں آنے والی بات اکثر ہو جاتی ہے۔ رشتے آئے مگر بات نہیں بنی۔ مشق سے نیلا نقطہ نظر آیا۔ آسمان پر سیاہ چوکور کپڑا دیکھا جو مغرب سے مشرق کی طرف دائروں میں آگے بڑھ رہا تھا۔ خواب دیکھا کہ شیطان صفت ہم زاد اپنے ساتھی کو دفنانے جا رہے ہیں، مجھے لے جانا چاہتے ہیں، میں بھاگ جاتی ہوں۔ پھر دیکھا کہ بزرگ امی کو بتا رہے ہیں کہ جھاڑو کیسے دیتے ہیں۔

**جواب:** شفا ہونے تک یہ عمل جاری رکھئے۔ عمل سے پہلے پورا غسل اور سر کے بال اچھی طرح دھونا ضروری ہے۔ نمک کا پرہیز کیجئے۔ بلڈ پریشر چیک کروایئے۔

### فقیری چولا

**رضیہ مقصود (اظہر کالونی):** بھائی نے والد کی جائیداد اپنے نام کروالی۔ بہنوں کو حصہ نہیں دیا۔ اسے ہر مہینے تین لاکھ روپے کرایہ ملتا ہے۔ جھکاؤ سسرال کی طرف ہے۔ میرے شوہر دوسرے شہر کمانے جاتے ہیں۔ تنخواہ 21 ہزار اور مکان کرائے کا ہے۔ گھر میں نو افراد ہیں۔ گزر بسر کس طرح ہوتی ہے، اللہ جانتا ہے۔ درخواست ہے کہ تصویر والے عمل کی اجازت دیں اور دعا کریں کہ بھائی مجھے میرا حق دے۔

**جواب:** آپ کا مسئلہ پڑھا۔ آپ نے دعا کے لئے لکھا ہے۔ انشاء اللہ میں عاجز بندہ فقیر دعا کروں گا۔ میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہیں۔ لباس سے مراد میرے نزدیک دو یونٹ ہیں۔ جب ازدواجی زندگی میں دو یونٹ ملتے ہیں تو ایک دوسرے کا لباس بن جاتے ہیں۔ آپ نے خط میں کروڑوں کی بات کی ہے۔ اچھی بہن! فقیر کے لئے ایک روپیہ اور کروڑ روپے، دونوں کی اہمیت نہیں۔ اگر اہمیت ہے تو میرے خیال میں وہ فقیری چولا نہیں پہن

سکتا۔ ماشاء اللہ آپ پڑھی لکھی اور سمجھ دار ہیں۔ لین دین کا حساب کتاب جانتی ہیں لیکن پیاری بہن! آپ نے یہ نہیں سوچا کہ جب بندہ پیدا ہوتا ہے تو ساتھ ایک بالشت لنگوٹی کا کپڑا نہیں لاتا اور جب اِس دنیا سے اُس دنیا میں واپس جاتا ہے تو جسمانی طور پر الف ہوتا ہے۔ اب یہ نصیب کی بات ہے کہ رشتہ دار محلے والے دو گز کپڑا—— کون سا کپڑا؟ کفن کا لٹھا ڈال دیں۔ ہم نے کبھی غور نہیں کیا، فکر نہیں کی، کوشش نہیں کی کہ ہم کہاں سے آتے ہیں۔ بغیر وسائل کے آتے ہیں اور دنیا میں وسائل جمع کرنے کے علاوہ ہماری کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ عجیب بات ہے کہ اُس پار دنیا سے جب آدمی اِس پار دنیا میں آتا ہے تو جسم پر کپڑے نہیں ہوتے، دنیا سے جاتا ہے تو رشتے دار جسم پر موجود کپڑے اتارنے کی زحمت نہیں کرتے، قینچی سے کاٹ کر پھینک دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔ نظام یہ ہے کہ جس ہستی نے ہمیں تخلیق کیا ہے اس نے اپنے بندوں کے لئے ہر قسم کے وسائل بھی تخلیق کئے ہیں۔ ماشاء اللہ آپ پڑھی لکھی ہیں۔ آپ کے شوہر کام کرتے ہیں۔ خرچ پورا نہیں ہوتا تو آپ کوئی کام شروع کر دیجئے۔ آج آپ کام کریں گی تو وہ دن بھی سامنے آئے گا جب مرد گھر میں بیٹھیں گے اور خواتین ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں کرسی پر بیٹھے ہوئے احکامات جاری کریں گی۔

**صفحہ نمبر 118**

**روبینہ (کراچی):** بیٹی 18 سال کی ہے۔ سیکنڈ

## پیراسائیکالوجی
(Parapsychology)

ماہنامہ قلندر شعور نومبر 2020ء

اماں کا نام : ..... سائل کا نام: .....

تاریخ اور وقت پیدائش : ..... تعلیم: ..... ازدواجی حیثیت: .....

جاگنے کا دورانیہ : ..... سانس کا دورانیہ کتنے سیکنڈ ہے: .....

کھانا پیٹ بھر کے کھاتے ہیں یا بھوک رکھ کر: ..... نمک زیادہ پسند ہے یا مٹھاس: .....

خیالات میں حقیقت پسندی ہے یا الوژن : ..... دستخط : .....

خط و کتابت کا پتہ : .....

..... رابطہ نمبر: .....

ائیر کی طالبہ ہے۔ رشتہ خاندان میں طے ہے۔ بہت خوش تھی، اب انکار کررہی ہے۔ سسرال والے اچھے ہیں۔ کہتی ہے کسی اور کو پسند کرتی ہوں شادی بھی اسی سے کروں گی۔ مکتبہ فکر الگ ہونے کی وجہ سے وہاں شادی نہیں کرسکتے۔ چاہتے ہیں کہ بیٹی کے دل سے اس لڑکے کا خیال نکل جائے۔

جواب: ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ اہلِ کتاب اور اللہ رب العالمین پر یقین کرنے والے حضرات و خواتین کی آپس میں شادی ہوسکتی ہے، مشرکین سے نہیں ہوسکتی۔ کتاب ''روحانی علاج'' میں صفحہ نمبر 118 پر مسائل کا حل موجود ہے۔

## تربیت

**ح۔ع (کراچی):** پھول سی بھتیجی ہے۔ عمر تین سال ہے۔ بھابھی صحیح تربیت نہیں کررہیں۔ کئی بار سمجھایا اور مطالعے کے لئے اچھی کتب دیں مگر بے سود۔ بھتیجی ضدی ہے، موبائل فون پر ویڈیوز اور تخریبی کارٹون دیکھ کر مارنا اور نوچنا عادت بن گئی ہے۔ ام الصبیان کا تعویذ چبا لیا۔ صبح ایک سلائس یا کم مقدار میں دلیہ دے کر کئی گھنٹے بھوکا رکھتی ہیں کہ موٹی نہ ہوجائے۔ بچی بلک بلک کر روتی ہے۔ اللہ نے ہر نعمت عطا کی ہے مگر بچی کو محروم رکھا جاتا ہے۔ چاہتی ہوں کہ بھتیجی کی صحت اچھی ہو اور وہ اچھی انسان بنے۔

**جواب:** مجھ عاجز فقیر نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ مدعی سست، گواہ چست۔

شاگردوں نے پیرومرشد سے پوچھا، آپ کی زندگی کا بہترین لمحہ کون سا ہے؟

مرشد نے فرمایا، میری زندگی کا بہترین لمحہ وہ ہے جب میں نے اپنے مرشد کے آگے سر تسلیم خم کیا۔

یہ بتاؤ اگر تم میری جگہ ہوتے اور یہی سوال میں تم سے کرتا تو کیا کہتے۔

شاگردوں نے سچائی سے اعتراف کیا، ہم کہتے کہ وہ لمحہ جب ہمیں آگہی ملی یا مشاہدہ ہوا۔

مرشد نے سچ بولنے پر شاگردوں کو سراہا اور فرمایا، اپنے پیرومرشد کے لئے میری عقیدت اس راستے میں ملنے والے انعامات سے بڑھ کر ہے۔

اس جواب سے شاگردوں نے سیکھا کہ ان کے مرشد کی مرکزیت کتنی راسخ ہے۔ وہ بتانا چاہتے ہیں کہ آگہی کو زندگی کا بہترین لمحہ کہنا ایک طرح سے انا کے جال میں پھنسنا اور اس احساس کا باور ہونا ہے کہ مجھے کچھ حاصل ہوا۔ جب کہ سرنڈر ہونے کے مرحلے کو بہترین کہنا ''فنافی الشیخ'' ہے۔

یہ مقام و مرتبہ وہی لوگ سمجھتے ہیں جو مقامِ عشق سے واقف ہیں۔

بی بی ایمن

# یا اللہ! میں جانتا نہیں، یہ مانتا نہیں

کچھ عرصے بعد ادراک ہوا کہ درخواستوں کا ترجمہ میں نے نہیں کیا بلکہ تصویر دیکھنے کے بعد ترجمہ کرتے وقت میں اور بچہ ایک ذہن ہوگئے۔ اس طرح درخواست بذات خود بچے کی تصویر بن گئی۔ درست طرزِ ادراک کے لئے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔

زندگی جذبات و احساسات سے معمور ہے۔ کبھی ہم خوش ہوتے ہیں، کبھی اداس ہوتے ہیں، غصہ غالب ہوتا ہے یا نرمی پیدا ہوتی ہے، بڑی بات نظر انداز کر دیتے ہیں اور چھوٹی بات پر ہنگامہ ہو جاتا ہے، کبھی خوف میں مبتلا ہوتے ہیں اور کبھی دل بے خوف ہو جاتا ہے۔

دل ہمہ وقت جذبات کی جائے پناہ ہے۔ خوشی کا احساس کچھ دیر ٹھہرتا ہے کہ ناخوشی آجاتی ہے۔ ناخوشی ختم ہوتی ہے، کوئی اور احساس دستک دیتا ہے۔ زندگی نہ ہوئی، جذبات کا بہتا ہوا دریا ہوگئی جس کی پُرشور لہروں سے ہمیں گزرنا ہے۔

بسا اوقات احساسات میں تبدیلی کی شرح اور رفتار کا پتہ نہیں چلتا۔ وجہ یہ ہے کہ حال میں رہ کر ماضی اور مستقبل کے لئے فکر مند ہیں اور ماضی اور مستقبل کے بارے میں سوچ کر حال کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ لمحۂ موجود میں زندگی گزارنے کے بجائے ماضی کی فکر اور مستقبل کے اندیشے ہیں۔

ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمیں جذبات کی اہمیت اور نتائج کا احساس نہیں۔

جذبات سے واقف ہونے کا طریقہ یکسوئی ہے اور یکسوئی کے لئے بہترین عمل مراقبہ ہے۔ مراقبہ ٹھہرنا اور خیال پر مرکوز رہنا سکھاتا ہے۔ اس طرح ہم احساسات سے واقف ہوتے ہیں۔

احساسات بنیادی طور پر تین قسم کے ہیں۔

۱۔ خوشگوار احساس

۲۔ ناخوشگوار احساس

۳۔ غیر جانب داری

مزاج کے خلاف بات پر ناگواری ہوتی ہے۔ کوئی کہتا ہے تم ذہین ہو، خوب صورت ہو، لباس دیدہ زیب ہے تو تعریفی کلمات سے خوشی ملتی ہے۔

ایک کیفیت وہ ہے کہ جب خوشی کا احساس ہو نہ غم محسوس ہو۔۔۔ بندہ ایسے مقام پر پہنچے جہاں کسی احساس سے سکونِ قلب متاثر نہ ہو۔

مشق: خاموش جگہ پر بیٹھیں، خوب صورتی اور نزاکت کے ساتھ آرام دہ نشست اختیار کر کے گہرا سانس لیں اور مسکرانے کی مشق کریں۔ مشق سے چہرہ پُرکشش اور وجود پُرسکون ہو جاتا ہے۔

کیسی ناشکری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن آنکھوں کو لاشمار اشکال اور رنگ دیکھنے کی صلاحیت عطا کی ہے وہ اداس رہتی ہیں۔ خوش رہنا ہے تو گھر میں پودے رکھیں یا چہل قدمی کریں۔ چہل قدمی کے دوران پودے، پھول، پرندے، بادل، آسمان اور بچوں کو دیکھیں۔ ہر وجود سے لہریں خارج ہوتی ہیں۔ نظر جس منظر پر پڑتی ہے، لہروں کی منتقلی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ مثبت چیزیں ہمیں مثبت لہروں سے سیر اب کرتی ہیں، منفی جذبات کی تاثیر منفی ہوتی ہے۔ اس لئے ماحول اور ذہن میں، ہنستے مسکراتے مناظر پر توجہ دیں۔

خوش اور ناخوش رہنے کا انحصار سوچ پر ہے۔ دانت میں درد ہے تو کہتے ہیں کہ درد نہ ہوتا تو ہم خوش رہتے۔ درد ختم ہو جاتا ہے پھر بھی ناخوشی دور نہیں ہوتی کیوں کہ ذہن ایک الجھن سے نکل کر دوسری الجھن میں مصروف ہو جاتا ہے۔

سوچ کا تعلق مفہوم اخذ کرنے سے ہے۔

۱۔ خاکی رنگ پنسل دیکھ کر ذہن میں پنسل سے متعلق رائے قائم ہوتی ہے۔ تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ پنسل کی اصل حقیقت اس سے مختلف ہو سکتی ہے جو رائے ہمارے ذہن میں بنی ہے۔

۲۔ ذہن میں دوست کی شبیہ اس تصور سے مختلف ہے جس نظر سے دوست خود کو دیکھتا ہے۔ کوئی اپنے علاوہ کسی کی اندرونی کیفیت کے بارے میں نہیں بتا سکتا جب تک کہ خود کو نہ جان لے۔

۳۔ آسمان پر چمکتے دمکتے ستارے دیکھ کر ہم انجانی دنیا میں کھو جاتے ہیں مگر محقق کا کہنا ہے کہ جن ستاروں کو ہم دیکھ رہے ہیں، وہ وہاں نہیں ـــــ ہزاروں سال پہلے کا نقش ہیں۔

۴۔ غروب آفتاب کے وقت آسمان پر پھیلے ہوئے رنگ دلکش ہوتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سورج کو دیکھ رہے ہیں جب کہ سورج تقریباً آٹھ منٹ پہلے اس مقام سے ہٹ گیا ہے جہاں نظر آرہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سورج کی روشنی ہمارے سیارے (زمین) تک تقریباً آٹھ منٹ میں پہنچتی ہے یعنی ہم حال کے بجائے ماضی کا سورج دیکھتے ہیں۔

۵۔ صبح صادق کے وقت مدہم روشنی میں چہل قدمی کرتے ہوئے سانپ پر نظر پڑتی ہے اور چیخ نکل جاتی ہے۔ موبائل فون یا ٹارچ کی روشنی سے معلوم ہوتا ہے کہ سانپ نہیں، رسی ہے۔

یہ مثالیں غلط فہمی کی طرف اشارہ ہیں۔

فہم درست نہ ہو تو غلط فہمی ہوتی ہے۔ جیسے میاں بیوی ایک دوسرے کو نہیں سمجھتے تو ایک دوسرے کی ناپسندیدہ عادت پر تلملاتے ہیں۔ پریشانی کا سبب عادت نہیں، ایک دوسرے کو نہ سمجھنا ہے۔

ایک نم آلود صبح ملاح کشتی لے کر نکلا۔ تھوڑا فاصلہ طے کیا تھا کہ سامنے سے دوسری کشتی آتی دکھائی دی۔ چیخنے لگا کہ احتیاط! احتیاط! مگر کشتی کی سمت تبدیل نہیں ہوئی اور تصادم ہو گیا۔ کشتی الٹنے سے بچ گئی مگر ملاح پانی میں گر گیا۔ عمر کا بڑا حصہ سمندر میں گزارنے کی وجہ سے تیراکی آتی تھی۔ اسے طیش آیا اور دوسرے ملاح پر لفظی نشتر کی بوچھاڑ کر دی۔ دوسری طرف خاموشی تھی۔ قریب جا کر دیکھا تو کشتی خالی تھی۔

غصہ بخارات بن گیا۔

روحانیت فرد کو حالات و واقعات کی حقیقت سے واقفیت کے لئے گہرائی میں دیکھنا سکھاتی ہے تاکہ آدمی غلط فہمی کا شکار ہو کر گم راہ نہ ہو۔

اولیائے کرام فرماتے ہیں:

”جاننے کے لئے اس شے سے ہم آہنگ ہونا ہو گا جسے سمجھنا چاہتے ہیں۔“

بدھ مت کے ایک استاد کی روداد پڑھی۔ ایک تجربہ بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

”میں نے ایک کمیٹی کے ساتھ کام کیا جو ویتنام کی جنگ میں یتیم ہونے والے بچوں کی مدد کر رہی تھی۔ ویتنام سے درخواستیں آتی تھیں جن میں نام، عمر اور مختصر حالات کے ساتھ بچوں کی تصویر تھی۔ ہم ان کا انگریزی، فرانسیسی، ڈچ اور جرمن زبان میں ترجمہ کرتے تھے تاکہ بچے کے لئے اسپانسر تلاش کیا جائے جس سے خوراک اور تعلیم کا بندوبست ہو اور بچے کو ویتنام میں کسی خاندان کی کفالت میں دیا جا سکے۔ اسپانسر کی جانب سے ملنے والی رقم اس خاندان کو بچے کے اخراجات کے لئے دی جاتی تھی۔

میں روز 30 درخواستوں کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کرتا تھا۔ میرا طریقہ یہ تھا کہ کوائف پڑھے بغیر تصویر کو عموماً 30 سے 40 سیکنڈ دیکھتا اس طرح تصویر اور میں ایک ہو جاتے۔ بعد ازاں درخواست کا فرانسیسی میں ترجمہ کرتا۔ وجہ معلوم نہیں تھی کہ ایسا کیوں کرتا ہوں۔ کچھ عرصے بعد ادراک ہوا کہ درخواستوں کا ترجمہ میں نے نہیں کیا بلکہ تصویر دیکھنے کے بعد ترجمہ کرتے وقت میں اور بچہ یک ذہن ہو گئے۔ اس طرح درخواست بذات خود بچے کی تصویر بن گئی۔ درست طرزِ ادراک کا طریقہ ہم آہنگ ہونا ہے۔“

نمک کا ذرّہ سمندر میں نمکیات کا تناسب جاننا چاہے تو ذرّے کو سمندر سے ملنا ہو گا تاکہ طرزِ فہم

اور طرزِ ادراک درست ہو۔ جوہری طبیعیات کے ماہرین نے اس قانون کی اہمیت کو کسی حد تک محسوس کر لیا ہے۔ جب وہ ذیلی ایٹمی ذرّات کی دنیا میں منہمک ہوتے ہیں تو دراصل ان ذرّات میں اپنا ذہن دیکھتے ہیں۔ الیکٹران کیا ہے ؟ الیکٹران درحقیقت وہ ہے جو ہمارے ذہن میں الیکٹران کا تصور ہے۔ قانون ہے کہ جس شے پر تحقیق کی جاتی ہے، ذہن اس میں داخل ہو جاتا ہے۔

جدید طبیعیات کے ماہرین کہتے ہیں:

"تحقیق میں observer (شاہد) کا لفظ مستند نہیں رہا کہ شاہد اور شے مختلف ہیں۔ جب تک دونوں ایک نہ ہوں، محقق سب ایٹامک نیوکلیئر سائنس میں نئی جہتوں سے واقف نہیں ہو سکتا۔ Participant کا لفظ مناسب ہے کہ تفکر کے دوران ذہن شے سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔"

ایک استاد نے کہا کہ وہ لیکچر دیتے وقت کوشش کرتے ہیں کہ خود کو طالب علم سے الگ محسوس نہ کریں۔ یہی وہ طالب علم سے چاہتے ہیں۔

روحانیت میں یہ مشق بہت کارگر ہے۔ جب مرید کا ذہن مرشد کے ذہن سے ملتا ہے تو الفاظ کی ضرورت نہیں رہتی، خاموشی گفتگو بن جاتی ہے۔

ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ نے اپنے نانا شہنشاہ ہفت اقلیم بابا تاج الدین ناگپوریؒ کی محفل کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نانا تاج الدینؒ کے ذہن سے تسلسل کے ساتھ سننے والوں کے ذہن میں روشنی کی لہریں منتقل ہو رہی ہیں اور ایسا بھی ہوتا کہ وہ بالکل خاموش بیٹھے ہیں اور حاضرین من و عن ہر وہ بات اپنے ذہن میں سمجھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں جو ناناؒ کے ذہن میں اس وقت گشت کر رہی ہے۔"

(کتاب: تذکرہ تاج الدین باباؒ)

غلط فہمی ہمیشہ دو کے درمیان پیدا ہوتی ہے۔ چاہے یہ دو افراد ہوں یا فرد اور شے۔ دونوں کی مثالیں مضمون کی ابتدا میں دی جا چکی ہیں۔

فہم میں خامی کا سبب کیا ہے؟ ہم لوگوں کو اپنے حالات و واقعات سے پرکھتے ہیں اور اپنی نظر سے دیکھتے ہیں۔ نتیجے میں غلط فہمی پیدا ہوتی ہے جو ناخوشی کا سبب بنتی ہے اور تعلق کشیدہ ہو جاتا ہے۔

زندگی گزارنے اور رویے میں اعتدال کا بہترین اصول یہ ہے کہ کوئی بات ناگوار گزرے تو خود کو کہنے والے کی جگہ پر رکھ کر سوچیں کہ اس نے ایسا کیوں کہا۔ ہم اس کی جگہ ہوتے تو کیا کہتے؟

"اندر میں" دنیا سے واقف خواتین و حضرات کہتے ہیں کہ اگر آپ دو سے گریز کرنا چاہتے ہیں تو ایک سے بھی گریز کرنا ہو گا یعنی کسی کو خود سے

الگ نہ سمجھیں، سب میں اشتراک ہے، چاہے ذرّہ بھر کیوں نہ ہو۔ دو کا وجود ایک کے سبب ہے جیسے ایک میں اور ایک میری بہن۔ دیکھنے کی دوسری نظر یہ ہے کہ میں اور بہن دونوں ایک ماں کی اولاد اور ایک خون سے بنے ہیں۔ پھر الگ کیسے ہوئے؟

بنیادی اصول: جسم کو جسم میں، احساس کو احساس میں، ذہن کو ذہن میں اور شے کو شے میں تفکر کریں۔ ''جسم کو جسم'' میں کے الفاظ، لفظ کی تکرار نہیں۔ مفہوم یہ ہے کہ ہم جسم سے باہر نہیں جسم کے اندر ہیں۔ جس چیز پر تفکر کرنا ہے، اسے خود سے الگ سمجھنے سے صحیح فہم حاصل نہیں ہوتی۔

''جو لوگ راسخ فی العلم ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہمارا اس بات پر ایمان ہے کہ ہر شے اللہ کی طرف سے ہے۔'' (اٰل عمرٰن: ۷)

راسخ کے معنی یک رنگ، یک ذہن ہونا ہے۔ جو لوگ علمِ حقیقی میں راسخ ہو جاتے ہیں وہ ہر شے میں اللہ کی صفات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

نکتہ قابلِ غور ہے، دوبارہ پڑھیں۔

۱۔ سانس لیتے وقت ہم صرف فاعل نہیں ہیں جو سانس لے رہا ہے ـــــ ہم خود سانس ہیں۔

۲۔ غصہ کرتے ہیں تو غصہ ہم سے الگ نہیں، ہم اس وقت غصے کی تصویر ہیں۔

۳۔ مسئلہ درپیش ہے، حل کرنا نہیں آتا، اسی لئے اس کو مسئلہ کہتے ہیں۔ دراصل حل کرنے میں ناکامی کی وجہ سے ہم خود مسئلہ بن گئے ہیں۔

کوئی کیفیت اور جذبہ فرد سے الگ نہیں۔ جذبات غالب ہونے میں امر عیاں ہے کہ ہم نے ان کے خول میں رہائش اختیار کرلی ہے۔ غصے کا مطلب غصے کا خول پہننا ہے۔

ماہرین کہتے ہیں کہ چڑچڑے پن یا ناگواری کے وقت مسکرانے کی کوشش کریں اور گہرے سانس لیں، منفی شدت کم ہو جائے گی۔ چڑچڑاپن ایسی توانائی ہے جو تباہی کی طرف لے جاتی ہے۔ ہم توانائی کو ختم نہیں کرسکتے، مثبت توانائی میں منتقل کرسکتے ہیں جیسے معاملہ فہمی اور عفو و درگزر۔

شاگرد نے پوچھا کہ غصہ پر غلبہ کیسے حاصل ہو؟

استاد نے فرمایا، فرض کرو کہ تم صحرا میں ہو اور شدید پیاس لگی ہے۔ تمہارے پاس ایک گلاس پانی ہے اور پانی میں مٹی ہے۔ دور دور تک فردیا کنواں نہیں۔ کیا پانی پھینک دوگے؟

شاگرد نے استاد کی بتائی ہوئی صورت حال میں خود کو رکھا اور جواب دیا، نہیں۔

استاد نے کہا، تمہاری کوشش ہوگی کہ پانی صاف پانی میں تبدیل ہو جائے اور ہونا بھی یہی چاہئے۔ تم انتظار کروگے کہ مٹی نیچے جائے اور پانی اوپر رہ جائے۔ یہ غصے پر قابو پانے کا طریقہ ہے کہ غصے

کے جھاگ کو اترنے دو۔ غصہ تم سے الگ نہیں ہے تم خود غصہ بن کر فطرت سے دور ہو جاتے ہو۔

قارئین! اس جملے کو نیوٹرل ذہن سے پڑھئے۔ انشاء اللہ نتائج سامنے آئیں گے۔

فہم کو تنگ نظری اور فریبِ نظر سے پاک ہونا چاہئے۔ محدود علم فہم کی راہ میں رکاوٹ ہے۔

صوفی خواتین و حضرات کا کہنا ہے،

"جو نظر آتا ہے، آدمی سچ مان کر اس پر مضبوطی سے قائم رہتا ہے یہاں تک کہ جب سچائی دروازہ کھٹکھٹاتی ہے تو ایسا شخص دروازہ نہیں کھولتا گم راہی میں زندگی بسر کرتا ہے۔ وجہ اپنے نظریات اور محدود علم کو مکمل سمجھنا ہے۔"

تفہیم کا مطلب محدود علم سے کنارہ کشی ہے ورنہ تفہیم کی تعریف مکمل نہیں ہوتی۔ علم کے مراحل اسی طرح عبور کرنے چاہئیں جیسے ہم سیڑھیاں چڑھتے ہیں۔ اگر کوئی چھٹی سیڑھی پر پہنچ کر خود کو اونچائی پر سمجھے تو اس سے ساتویں سیڑھی پر چڑھنے کی امید نہ رکھیں۔ تفہیم کا طریقہ محدود سوچ اور نظریات کو چھوڑ کر آگے بڑھنا ہے۔ محدود علم چٹان کی مانند ہے جو سڑک بند کر دیتی ہے جب کہ لا محدودیت کی شاہراہ کا کوئی اختتام نہیں، یہاں ہر گام پر منزل ہے اور ہر منزل راستہ ہے۔

حضرت رشید احمد گنگوہیؒ کے پاس نوجوان آیا اور عرض کیا، میں جس سے شادی کرنا چاہتا ہوں، اس کے والدین راضی نہیں۔ آج اس کی شادی ہے۔

حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا، بھائی! میرا ان مسائل سے کیا تعلق۔ قرآن و حدیث کا درس دیتا ہوں۔ اس حوالے سے پوچھنا چاہو تو پوچھ سکتے ہو۔

عرض کیا، نہیں حضور! مجھے آپ پر یقین ہے۔

بہت سمجھایا لیکن وہ نہیں مانا۔ تعویذ لکھ دیا اور فرمایا کہ فوراً سفید کپڑے میں باندھ کر بازو پر باندھ لو۔

لڑکے نے کرتہ چیرا اور تعویذ باندھ کر گھر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد لڑکی والوں کی طرف سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا، چلو جلدی چلو، ہم راضی ہیں۔ لڑکے والوں سے جھگڑا ہو گیا ہے، مہمان گھر پر ہیں، دیر کی گنجائش نہیں۔

شادی ہوئی اور لڑکی گھر لے آئے۔

لوگوں میں تعویذ کا چرچا ہو گیا۔ دوستوں نے تعویذ دیکھنے کی خواہش کی۔ لڑکے نے انکار کر دیا۔

ایک دن وہ غسل کر رہا تھا۔ کپڑے حمام سے باہر رکھے تھے۔ تعویذ بھی وہیں رکھ دیا۔ دوست تاک میں تھے۔ تعویذ اٹھا لیا اور کھول کر دیکھا تو لکھا تھا،

"یا اللہ! میں جانتا نہیں، اور یہ مانتا نہیں۔ یہ تیرا بندہ ہے اور تو اس کا رب۔ اب تو جان اور تیرا کام۔"

اللہ سے تعلق کے لئے صحیح نسبت درکار ہے اور صحیح نسبت، نسبت رکھنے والوں کے ساتھ رہنے سے حاصل ہوتی ہے۔

حامد ابراہیم

# وقت کیا ہے ـــــ؟

آصف بن برخیا نہ صرف تخت کی ماہیت اور تخلیقی مقداروں کا علم رکھتے تھے بلکہ سبا کے محل سے میلوں میل فاصلے پر رہتے ہوئے تمام احوال سے واقف تھے۔

زید اپنے ساتھیوں کے ساتھ تقریباً چھ کلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے دوسرے گاؤں پڑھنے جاتا ہے۔ جن کے پاس سائیکل ہے، وہ اسکول پہلے پہنچتے ہیں۔ زید نے سائیکل کی فرمائش کی۔ ابا نے گندم کی فصل کی کٹائی کے بعد سائیکل دلا دی۔ وہ خوشی سے نہال تقریباً 18 منٹ میں کالج پہنچا۔

زید نے دوستوں سے کہا کہ اگر سائیکل سے تیز رفتار سواری مل جائے تو کالج پہنچنے کا وقت مزید کم ہو جائے گا۔ خیال آیا کہ رفتار زیادہ سے زیادہ کتنی ہو سکتی ہے اور تیز ترین سواری کون سی ہے؟

پہلی کلاس فزکس کی تھی۔ زید نے سر سے پوچھا کہ ہوائی جہاز سے زیادہ تیز کوئی سواری ہے؟

سر نے بتایا، راکٹ کی رفتار ہوائی جہاز سے تیز ہے۔ راکٹ کے ذریعے خلا میں مصنوعی سیارے بھیجے گئے ہیں۔ محقق کہتے ہیں کہ ان میں سے چند ایک ہماری زمین چھوڑ کر دور چلے گئے ہیں اور نامعلوم راستے پر سفر میں ہیں، ان سیاروں کی رفتار راکٹ سے زیادہ ہو سکتی ہے۔

سر! کیا قدرت کی کوئی تخلیق راکٹ سے تیز رفتار ہے؟ سر مسکرا دیئے اور کہا، ایجاد خیال کے تابع ہے اور خیال قدرت کی طرف سے آتا ہے۔ ہوائی جہاز اور راکٹ پرندوں کو دیکھ کر بنائے گئے ہیں لیکن یہ پرندوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہوائی جہاز چلانے کے لئے پٹرول چاہئے۔ قدرت اسی عمل کو پرندوں میں سانس کے ذریعے انجام دیتی ہے۔ اور پٹرول کس نے بنایا؟ جتنی ایجادات ہیں، محقق نے خیال میں تفکر کیا، قدرت نے مدد کی۔ رہا سوال تیز رفتار شے کا تو محقق روشنی کو کائنات میں سب سے تیز رفتار قرار دیتے ہیں۔

زید نے کچھ دیر سوچتے ہوئے کہا، سر! ہو سکتا ہے محقق کو ابھی اتنا ہی پتہ ہو۔

سر کو جواب سن کر خوشی ہوئی۔ قریب جا کر تھپکی دی اور کہا، جی ہاں! ایسی تخلیقات ہیں جن کی رفتار روشنی سے زیادہ ہے۔ سائنس کا طریقِ کار مادے

کی حدود میں ہے، ان کو مادے سے پار دنیا کا علم نہیں۔ ممکن ہے مستقبل میں وہ جان لیں کہ مادہ اصل نہیں بلکہ اصل کچھ اور ہے۔

سر! اصل تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے؟

انہوں نے کہا، قرآن کریم۔ علم اللہ کا ہے اور اللہ کی کتاب سے ہی ملے گا۔ قرآن کو ترجمے کے ساتھ غور و فکر سے ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا عادت بنالو، انشاء اللہ حکمت ظاہر ہوگی اور کائناتی علوم کی راہ کھلے گی۔ زید نے ممنونیت سے سر کو دیکھا۔

زید نے جب قرآن کریم میں حضرت سلیمانؑ کے دربار کا قصہ پڑھا تو حیرت زدہ رہ گیا۔

"سلیمانؑ نے کہا، اے اہلِ دربار! تم میں سے کون ہے جو اس کا تخت میرے پاس لائے اس سے پہلے کہ وہ سارے فرماں بردار ہو کر آئیں۔ ایک جن عفریت نے کہا کہ میں اس تخت کو لا سکتا ہوں اس سے پہلے کہ آپ اس مقام سے اٹھیں، میں اس پر قوی اور امین ہوں۔ دوسرے شخص انسان نے، جس کے پاس کتاب کا علم تھا، عرض کیا کہ میں تخت حاضر کر سکتا ہوں اس سے پہلے کہ آپ پلک جھپکیں۔ پس جب سلیمانؑ نے تخت کو پاس رکھا دیکھا تو کہا کہ یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری اور جو شکر کرے وہ اپنے بھلے کے لئے شکر کرتا ہے اور جو ناشکری کرے تو میرا رب بے نیاز سب خوبیوں والا ہے۔" (النمل:۳۸۔۴۰)

زید کے تصور میں تیز ترین ایجادات کی فلم گھوم گئی اور ہر ایجاد قرآن میں بیان رفتار کے سامنے بے معنی لگی۔ زید اس وقت گھر میں تھا، اگلے لمحے تصور میں خود کو ہزاروں میل دور پہاڑ کی چوٹی پر دیکھا۔ وہ چونک گیا کہ جو کام "علم الکتاب" کے حامل بندے نے کیا، ہم اس مظاہرے سے خیال کی دنیا میں ہر وقت گزرتے ہیں۔ کیا میں خیال میں تصرف کر کے جسم کے ساتھ ہزاروں میل کا سفر کر کے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ سکتا ہوں؟ موجودہ علوم ٹائم اور اسپیس کے بارے میں کتنا جانتے ہیں؟

قارئین! زید کے سوالات کا جواب جاننے کے لئے پہلے سائنسی تجربات، نظریات اور مفروضات کا جائزہ لیتے ہیں۔

ابتدائی زمانے سے لے کر اب تک شے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے ذرائع میں ترقی ہوئی ہے لیکن نقل مکانی کے اعتبار سے بنیادی یا انقلابی تبدیلی نہیں آئی۔

مثال: الف اور ب دو مقامات ہیں۔ درمیان میں ہزار میل کا فاصلہ ہے۔ الف سے ب تک 10 ہزار کلو نمک پہنچانا ہے۔ سو اونٹوں پر سو کلو گرام فی اونٹ کے حساب سے نمک کی بوریاں رکھی جاتی ہیں۔ باقی 20 اونٹوں پر تاجر اور مزدور سوار ہیں۔

یہ لوگ آٹھ ہفتوں میں منزل پر پہنچتے ہیں۔ اگر یہ سفر بادبانی بحری جہاز میں ہو تو سات دن میں طے ہو گا بشرطیکہ موسم طوفانی نہ ہو اور ہوا موافق سمت میں چل رہی ہو۔ موجودہ دور کے مال بردار بحری جہازوں پر یہ فاصلہ دو سے تین دن میں طے ہو گا۔ اگر ہوائی جہاز کی رفتار پانچ سو میل فی گھنٹا ہو تو 10 ہزار کلو نمک تقریباً دو گھنٹے میں منزل پر پہنچے گا۔ سواریوں میں فرق ہے لیکن راستہ ایک ہے۔

ملکہ بلقیس کے دربار سے تخت پلک جھپکنے سے کم وقت میں غائب ہوتا ہے اور تقریباً 1500 سو میل کے فاصلے پر حضرت سلیمانؑ کے محل میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہ عمل مادی اعتبار سے لمحے سے کم وقت میں ظہور پذیر ہوا۔

لمحہ کیا ہے؟ محققین نے سیکنڈ کو لاکھ، دس لاکھ، کروڑ، ارب اور کھرب حصوں میں تقسیم کیا ہے مگر وقت کی ان مختصر مقداروں کا احساس عملی طور پر کسی محقق کو نہیں ہوا۔ یہ اکائیاں حساب و کتاب اور نظریات و مفروضات کے لئے ضروری مواد مہیا کرتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس شے کا مشاہدہ نہ ہو، اس کے علم کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

سبا کی ملکہ بلقیس کے تخت کا پلک جھپکنے سے بھی کم وقت میں تبدیلی اور خرابی کے بغیر نقل مکانی کرنا روایتی نقل و حمل کے طریقوں سے یکسر مختلف ہے۔ چوپایوں، گاڑی، بحری جہاز یا ہوائی جہاز کے ذریعے اشیا منتقل کرنے میں بنیادی اصول یہ ہے کہ فاصلہ اور وقت بالترتیب گز بہ گز اور لمحہ بہ لمحہ طے ہو۔ دوسری طرف ملکہ بلقیس کے تخت کو جس شخص نے منتقل کیا، وہ اپنی جگہ موجود رہا اور حکم ملتے ہی تخت حاضر ہو گیا۔ فاصلہ اور وقت یہاں بھی طے ہوا لیکن رفتار اتنی تیز تھی کہ وقت اور فاصلہ ناقابل تذکرہ ہو گئے۔

محققین نے مادے اور توانائی پر جتنی تحقیق کی ہے، اس کے آئینے میں سمجھنے کی کوشش کی جائے تو ہمارے پاس اس توجیہ کے سوا کوئی جواب نہیں ہے کہ یہ سب لہروں کے نظام کو حرکت میں لانے یا لہروں میں تصرف سے ممکن ہوا۔

محقق تسلیم کرتے ہیں کہ مادے کی کسی حالت کو انتہائی حد تک منتشر کیا جائے تو نتیجہ لہر ہے جو ہر شے کی بنیاد ہے۔ مادہ اور توانائی لہر کے روپ ہیں۔

قانون: تسخیر کا قانون یہ ہے کہ لہر کی صفات کو کسی بھی شے پر محیط کر کے اس شے کو حسبِ منشا متحرک کیا جا سکتا ہے۔

محققین نے لہر کی ایک قسم کو دوسری قسم میں تبدیل کرنے اور دوبارہ پہلی قسم میں منتقل کرنے کا طریقہ کسی حد تک دریافت کیا ہے لیکن مادے کو لہر میں تبدیل کرنے اور دوبارہ مادی صورت میں لانے میں ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔

کچھ تجربات موجود ہیں جن میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ شے کے مقام کی منتقلی کا عمل لہروں یا غیر مادی ذریعے سے انجام پایا ہے لیکن محققین کی اکثریت ان کو تسلیم نہیں کرتی۔

معروف مثال فلاڈیلفیا کا تجربہ ہے۔

جنگی بحری جہاز کو فلاڈیلفیا کے ساحل سے چشم زدن میں غائب کر کے نیویارک کے ساحل پر ظاہر کرنے کا دعویٰ کیا گیا۔ پھر جہاز کو ٹائم اور اسپیس کی کسی اور جہت میں منتقل کیا گیا جہاں جہاز کے عملے نے ایسی مخلوقات دیکھیں جن کا مشاہدہ پہلے نہیں ہوا۔ جہاز دوبارہ فلاڈیلفیا کے ساحل پر ظاہر ہوا۔ جب کہ عملے کے چند ارکان، جہاز کے دھاتی جسم میں پیوست تھے۔ محققین کی اکثریت اس دعوے کو تسلیم نہیں کرتی۔

اس طرح کہ کئی دعوے موجود ہیں جن سے کم از کم یہ ضرور واضح ہوتا ہے کہ محقق نے الہامی کتابوں میں موجود نقل مکانی کے فارمولے کی طرز پر تجربات کی کوشش کی ہے۔

جب بجلی سے چلنے والے آلات کی ایجادات کا سلسلہ شروع ہوا تو بجلی پیدا ہونے کے مقام سے لے کر کارخانوں، دفاتر اور گھروں میں ترسیل کے لئے ایسے نظام کی ضرورت تھی جو بجلی کو راستے میں ضائع ہونے سے زیادہ سے زیادہ بچا سکے اور مطلوبہ وولٹیج ہر جگہ پہنچے۔ اس طرح کے مستحکم نظام کے لئے دو نام سرفہرست ہیں۔ تھامس ایڈیسن اور نکولا ٹیسلا۔ ایڈیسن نے بجلی کی ترسیل کے لئے مستقل برقی رو (DC) کی حمایت کی جب کہ ٹیسلا نے متغیر برقی رو (AC) کی وکالت کی اور ایک جنریٹر ایجاد کیا جو آج بھی معمولی تبدیلی کے ساتھ استعمال میں ہے۔ برقی رو کی اس جنگ میں انجینئر اور صنعت کار بھی شامل ہو گئے۔ بالآخر متغیر برقی رو (AC) کے نظریے کو فتح نصیب ہوئی۔

ٹیسلا نے AC کے علاوہ برقی ترسیل کا ایک اور نظام پیش کیا کہ بجلی کو لہروں کے ذریعے زمین اور فضا میں پھیلایا جائے اور جہاں ضرورت ہو وہاں اس فریکوئنسی سے ہم آہنگ فریکوئنسی پیدا کر کے بجلی حاصل کی جائے۔ اس خیال کے مطابق ریڈیو ٹاور کی طرح ایک ٹاور (ٹرانسمیٹر) سے برقی توانائی کو فضا میں نشر کیا جاتا اور دھاتی سلاخ اور ٹرانسمیٹر زمین میں کچھ گہرائی تک دبا کر برقی لہریں زمین میں پھیلائی جاتیں۔ تاہم اس نظریے کو پذیرائی نہیں ملی۔ اب وائرلیس چارجنگ کے بڑھتے ہوئے رجحان نے محقق کو از سر نو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ توانائی، چاہے کسی بھی قسم کی ہو، تار کے بغیر لہروں کے ذریعے ترسیل کی جائے۔

مادہ اور توانائی کی بنیاد لہر ہے۔ محقق اس حقیقت

سے کسی حد تک واقف ہے کہ مادے کو توانائی اور توانائی کو مادے میں منتقل کرنا ممکن ہے۔

توانائی، آواز، روشنی، حرارت، تابکاری غرض ہر شے لہروں پر مشتمل ہے اور سب کی فریکوئنسی مخصوص ہے۔ جب ایک لہر دوسری لہر میں تبدیل ہوتی ہے تو مقداروں یعنی فریکوئنسی اور طول موج میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ ریڈیو، ٹی وی اور موبائل فون وغیرہ میں یہی عمل کارفرما ہے۔ وہ لہر جس پر شے کا قیام ہے، اس کا علم حاصل ہو جائے تو شے کہیں بھی منتقل کی جاسکتی ہے۔

حضرت سلیمانؑ کے دربار میں موجود ''کتاب'' کا علم رکھنے والے بندے کا نام آصف بن برخیا بتایا جاتا ہے۔ آصف بن برخیا نہ صرف تخت کی ماہیت اور تخلیقی مقداروں کا علم رکھتے تھے بلکہ سبا کے محل سے میلوں میل فاصلے پر رہتے ہوئے تمام احوال سے واقف تھے۔ یہ وہ علم ہے جس میں ٹائم اور اسپیس محدود اندازوں سے ماورا ہے۔

''جو لوگ میرے لئے جدوجہد کرتے ہیں، میں ان کے لئے اپنی راہیں کھول دیتا ہوں۔''

(العنکبوت: ۶۹)

آصف بن برخیا، پیغمبر سلیمانؑ کے امتی تھے۔ انہوں نے پیغمبر کے حکم پر لہروں میں تصرف کے علم کا مظاہرہ کیا۔ اس واقعے میں پیغام ہے کہ الٰہی

> پرندہ زندہ ہوتا ہے تو چیونٹی کھاتا ہے اور جب پرندہ مر جاتا ہے تو چیونٹی اسے کھاتی ہے۔ ایک درخت سے لاکھوں ماچس کی تیلیاں بنتی ہیں اور لاکھوں درختوں کو خاکستر کرنے کے لئے ایک تیلی کافی ہے۔ حالات کسی بھی وقت بدل سکتے ہیں اس لئے کسی کو خود سے کم سمجھو نہ اسے آزار پہنچاؤ۔ آج تم طاقت ور ہو لیکن یاد رکھو! وقت کی طاقت تم سے زیادہ ہے۔

تعلیمات پر عمل کرنے اور علمِ حقیقی سیکھنے کے لئے جدوجہد کرنے والے شخص کو حکمت عطا ہوتی ہے۔

محترم عظیمی صاحب فرماتے ہیں:

''اللہ قادر مطلق نے اس بات پر زور دیا ہے کہ قرآن کریم میں وہ علم موجود ہے جس سے ہم ہر طرح سے استفادہ کرسکتے ہیں۔ ہر بندے کے اندر یہ صلاحیت موجود ہے۔ اب اگر کوئی بندہ اس صلاحیت کو اہمیت نہ دے اور یہ سمجھے کہ میری کیا حقیقت ہے کہ میں اس علم کو سمجھ سکوں تو یہ ناشکری ہے اس لئے کہ اللہ نے حضرت سلیمانؑ کے قصے میں بندے کا تذکرہ کرکے انسان کے لئے یہ علم عام کر دیا ہے بشرطیکہ وہ تفکر سے کام لے۔ ''علم الکتاب'' حاصل کرنے کے لئے روح سے واقف ہونا ہوگا اور روح سے واقف ہونے کے لئے باطن میں سفر کرنا ضروری ہے۔''

Manufacturer of
Embroided Lace & Fabrics

# PRIME LACE INDUSTRIES
## (PVT.) LTD.

C-8, S.I.T.E, Hyderabad
Tel: 022-3880107 Fax: 022-3880381

سید نوشاد کاظمی
(افسانہ)

# دس ہزار برس پرانی ڈائری

ہیڈ ماسٹر ریاض بخش کے چہرے پر حیرت کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ پانی پینا بھول گئے۔ پروفیسر عثمان نے کہا، زیادہ حیرت انگیز بات ابھی آپ نے سنی نہیں جس کا ذکر بازیستان کے ادیب نے کیا ہے۔

اسرار کے پردوں میں ملفوف پروفیسر عثمان کا مکان قصبے کے لوگوں کے لئے معمّا تھا۔ پروفیسر صاحب نے 24 برس پہلے شہر سے دور اس قصبے میں زمین خرید کر حویلی نما مکان بنوایا۔ قصبے کے بچے جوان اور جوان بوڑھے ہوگئے تھے مگر حویلی کی زندگی اب تک پردۂ اخفا میں تھی۔

پروفیسر عثمان کی عمر 70 برس تھی۔ یہاں آنے سے قبل زندگی کہاں گزاری اور رشتہ دار کون تھے، کسی کو معلوم نہ تھا۔ 24 برس میں دو مواقع ایسے آئے کہ جب کوئی دوست ان سے ملنے آیا اور اس بات کو بھی 14 برس ہو چکے تھے۔

ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ریاض بخش واحد شخص تھے جو کبھی کبھار حویلی جاتے تھے۔ ان کی زبانی قصبے والوں کو معلوم ہوا کہ پروفیسر صاحب معدوم زبانوں پر تحقیق کر رہے ہیں۔ بیوی فوت ہو چکی ہے اور بچے بیرون ملک مقیم ہیں۔

قصبے میں مشہور تھا کہ پروفیسر صاحب کسی سے نہیں ملتے، گھر میں رہتے ہیں۔ البتہ گرمیوں میں دو تین ماہ سیر و سیاحت کے لئے چلے جاتے ہیں۔ یہ بات ان کے ڈرائیور عمر دین کے ذریعے معلوم ہوئی — لیکن عمر دین نے تفصیل نہیں بتائی۔

عمر دین جب پروفیسر صاحب کے ساتھ یہاں آیا تھا تو جوان تھا۔ اب اس نے بھی بڑھاپے میں قدم رکھ دیا تھا۔ دو تین مہینے بعد پانچ دس دن کے لئے بیوی بچوں سے ملنے جاتا تھا۔

پروفیسر صاحب کی ملازمہ اماں فضیلت ضعیف بے سہارا خاتون تھیں۔ ان کو بھی زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ انہوں نے قصبے کی خواتین کو یہی بتایا کہ صاحب دن رات مطالعے میں مصروف رہتے ہیں، ضرورت کے تحت بات کرتے ہیں، اکثر رات کو گھنٹوں کمپیوٹر استعمال کرتے ہیں اور حویلی کا بڑا کمرا کتابوں سے بھرا ہوا ہے۔ اماں فضیلت گھر کی جھاڑ پونچھ کے علاوہ کھانا بھی پکاتی تھیں۔

ڈرائیور عمر دین کی رائے تھی کہ پروفیسر عثمان کو

کوئی صدمہ پہنچا ہے اور غم بھلانے کے لئے انہوں نے بچوں کے ساتھ رہنے کے بجائے شہر کے ہنگام سے دور کتابوں میں دل لگالیا ہے۔

اسکول کے ہیڈ ماسٹر ریاض بخش تحقیق کا ذوق رکھتے تھے۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ پروفیسر صاحب سے زیادہ سے زیادہ ملاقات ہو مگر انہیں کہہ دیا گیا تھا کہ جب بلایا جائے، تب ملنے آئیں کیوں کہ ملنے ملانے سے تحقیق میں خلل پڑتا ہے۔

موسم گرما کی تعطیلات قریب تھیں۔ قصبے کے ہائی اسکول کو سرکاری مکتوب موصول ہوا کہ اس سال گرمی میں شدت کی وجہ سے اسکول دو کے بجائے تین ماہ بند رہیں گے لہٰذا طالب علموں کو ہوم ورک دے کر چھٹی دے دی جائے۔

تعطیلات سے پہلے آخری روز ہیڈ ماسٹر صاحب اسکول سے باہر آرہے تھے کہ دیکھا ڈرائیور عمر دین گیٹ کے باہر گاڑی کے پاس کھڑا ہے۔

نظر پڑتے ہی بولا، پروفیسر صاحب نے یاد کیا ہے، پرسوں جارہے ہیں، شاید واپس نہ آئیں۔

ہیڈ ماسٹر ریاض بخش کو حیرت ہوئی۔

عمر دین سے کہا، مجھے حویلی لے چلو۔

حویلی پہنچے تو پروفیسر عثمان لان میں ٹہل رہے تھے۔ ہیڈ ماسٹر کو دیکھتے ہی گھنے سایہ دار درخت کے نیچے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے اور بلند آواز سے کہا، اچھا ہوا آپ آگئے۔ میں پرسوں یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ جانے سے پہلے ملنا چاہتا تھا۔ ایک بار آپ نے پوچھا تھا کہ میں قدیم زبانیں کیوں سیکھ رہا ہوں اور ان کے ذریعے کس قسم کی معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ یہی بتانے کے آپ کو لئے بلایا ہے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئے۔

عمر دین نے گلاس میں پانی پیش کیا۔

پروفیسر صاحب نے حال چال پوچھنے کے بعد بات شروع کی — گمنام زمانے کی انسانی تہذیب کے بارے میں جو انکشافات ہوئے ہیں، میں استعجاب میں پڑ گیا ہوں اور یقین ہو گیا ہے کہ دنیا کی تباہی کا وقت آپہنچا ہے۔

ہیڈ ماسٹر ریاض بخش کی آنکھیں پھیل گئیں۔

ایسا کیا انکشاف ہوا ہے؟

ریاض صاحب! میں نے معدوم زبانیں سمجھنے میں زندگی کے 50 برس صرف کر دیئے۔ شدید خواہش تھی کہ دس ہزار برس قبل کی بود و باش، طرزِ معاشرت اور اس دور کے مروجہ علوم جان سکوں۔ میں تلاش میں لگا رہا، قدیم زبانیں سیکھنے کی کوشش کی اور آثار قدیمہ سے ملنے والی تحریریں پڑھنا شروع کر دیں۔ معلومات میں اضافہ ہوا۔

سب سے زیادہ اور اہم معلومات ایک ترقی یافتہ ملک کی قدیم لائبریری سے ملنے والی ڈائری سے حاصل ہوئیں۔ ڈائری 10 ہزار سال پرانی ہے۔ میں اس کی اکثر تحریریں پڑھنے میں کام یاب ہو گیا مگر بعض عبارتیں ایسی ہیں جن میں اصطلاحوں کی وجہ سے درست مفہوم اخذ کرنا ممکن نہیں۔ یہ ڈائری 10 ہزار سال قبل کے ایک ادیب کی ہے۔ پڑھنے سے معلوم ہوا کہ اس دور کے حالات اور آج کی دنیا میں بہت مماثلت ہے۔

اچھا—— وہ کیسے؟ اشتیاق سے پوچھا۔

پروفیسر عثمان نے کہا، قدیم ادیب کی ڈائری سے 10 ہزار سال قبل کے آدمی کے شعوری ارتقا اور عصری علوم پر مفصل روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً ادیب جس کا نام ہمارے حروف تہجی میں ترجمہ کرنے سے "عجوب العجزام" بنتا ہے، کا تعلق گم شدہ براعظم "اٹلانٹس" کے ملک بازیستان سے تھا۔ اس نے کل پانچ براعظموں کا ذکر کیا ہے۔

ہیڈ ماسٹر بیچ میں بول پڑے، وہ براعظم اب کہاں ہیں؟ اِس وقت تو سات براعظم ہیں۔

پروفیسر صاحب بولے، سب زیر آب آ گئے۔ اٹلانٹس ان گم شدہ براعظموں میں سے تھا۔ عظیم زلزلے نے ان کو الٹ دیا۔ زمین جہاں وہ قدیم تہذیب موجود تھی، سمندر میں غرق ہو گئی اور اس کے ساتھ اس دور کی تہذیب معدوم ہو گئی۔ ان کے علوم و ٹیکنالوجی کی ٹھوس شہادت ہم تک نہیں پہنچ سکی۔ جو کچھ معلوم ہوا ہے اس کے مطابق وہ ہم سے زیادہ ترقی یافتہ لوگ تھے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب گہری سوچ میں گم تھے۔

پروفیسر عثمان نے پوچھا، کہاں گم ہو گئے؟

جواب دیا، سوچ رہا ہوں کہ آج اتنی ترقی کے بعد بھی ہم ماضی کے علوم، ٹیکنالوجی اور سائنس سے بے خبر ہیں پھر وہ دور کیسا ہو گا؟

پروفیسر صاحب بولے، نہیں! ایسی بات نہیں۔ اٹلانٹس کے بارے میں اس ڈائری سے پہلے بھی معلومات اور شواہد ملے ہیں۔ جیسا کہ 10 ہزار سال قبل آدمی کلوننگ اور جینیاتی ٹیکنالوجی کا ماہر تھا اور نینو ٹیکنالوجی میں ہم سے بہت آگے تھا۔ انہوں نے خلائی ٹیکنالوجی، لاسلکی نظام اور موجودہ دور سے کہیں بہتر ٹیکنالوجی حاصل کر لی تھی۔ وہ پیراسائیکالوجی کے علم میں بھی آگے تھے۔

ہیڈ ماسٹر ریاض بخش کے چہرے پر حیرت کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ پانی پینا بھول گئے۔

زیادہ حیرت ناک بات ابھی آپ نے سنی نہیں جس کا ذکر بازیستان کے ادیب نے کیا ہے۔

وہ کیا؟ بے تابی سے پوچھا۔

پروفیسر صاحب نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں

بتایا، ان لوگوں نے کلوننگ اور جینیاتی ٹیکنالوجی میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کرلی تھی۔ محدود سوچ اور مضبوط جسم کی فورس یعنی مزدور بنالئے تھے جو اجرت کے بغیر کام کرتے تھے۔ جسمانی ساخت کم زور ہونے پر انہیں مار دیا جاتا تھا۔ اس قابلِ رحم مخلوق کے لئے انسانیت کا درد رکھنے والے حلقوں کی طرف سے احتجاج ہوتے تھے مگر کسی نے اہمیت نہیں دی۔ آپ ان کی ترقی کا اندازہ اس بات سے لگاسکتے ہیں کہ انہوں نے سمندر میں کام کرنے کے لئے کلوننگ اور جینیاتی انجینئرنگ کی مدد سے انسانی دماغ رکھنے والی مچھلی نما مخلوق بنائی تھی۔ اور تو اور —— مقتدر حلقوں نے لوگوں کو سزا دینے کا عجیب طریقہ رائج کیا تھا۔ وہ جینیاتی تبدیلی کرکے اجسام بدل دیتے تھے۔ جیسے کسی کا دھڑ گھوڑا نما بنادیا جاتا۔ یہ سب کرکے انہوں نے ظلم کی آخری حد پھلانگ لی اور نظام فطرت میں دخل اندازی شروع کردی۔ اس طرز عمل سے ایسی نوع وجود میں آگئی تھی جو نہ پوری طرح انسان تھی اور نہ حیوان۔

آدمی اور حیوان کا مخلوط! یہ تو بدترین ظلم تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

جی ہاں! پروفیسر عثمان تائید کی۔ پھر گویا ہوئے، وہ درندہ صفت بن گئے تھے لہٰذا قدرت نے ان کا نام ونشان مٹادیا۔ سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ ٹرانس ہیومن[1] ازم کے شعبے میں یہی کچھ آج کیا جارہا ہے اور ٹرانس جینک[2] پر سرعت سے کام ہورہا ہے۔ ٹرانس ہیومن ازم عالمگیر تحریک بن چکی ہے جس کے ذریعے ایسے آدمی بنانے کی کوشش کی جارہی ہے جن میں بے شمار صلاحیتیں ہوں اور وہ پوسٹ ہیومن کہلائیں۔ ان کے سامنے ہم ایسے ہوں گے جیسے بندر۔

موجودہ دور کے بعض محقق کہتے ہیں کہ وہ وقت آپہنچا ہے کہ ہمیں خود کو Homo sapiens[3] کی ماہیت میں بدل دینا چاہئے۔ دنیا میں اس وقت ایسے کئی چھوٹے بڑے منصوبوں پر کام کیا جارہا ہے۔ رصد گاہوں میں "سوپر سولجر" بنانے کی کوشش تیزی سے جاری ہے۔ ماہرین کہتے ہیں یہ گونا گوں صلاحیتوں والی بے رحم فورس ہوگی۔

جینیٹک انجینئرنگ کے ذریعے عمر میں سینکڑوں سال اضافے کا منصوبہ زیر غور ہے۔ اسی طرح ہیڈ ماسٹر صاحب! آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ کئی افراد کی صلاحیتوں کو ایک DNA میں یکجا کرکے بہترین دماغ رکھنے والے بچے پیدا کرنے کی کوشش بھی تجربات کے مراحل میں ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ ایسا بچہ بیک وقت کئی والدین کا حقیقی بچہ ہوگا۔ ایک ادارہ "DARPA" کثیر سرمایہ خرچ کرکے

---

۱۔ مخلوط جینز سے نئی خصوصیات کے آدمی بنانا، ۲۔ مختلف نوعوں کے درمیان جینز کی منتقلی، ۳۔ نوع آدم کا حیاتیاتی نام

ایسے کئی منصوبوں پر کام کر چکا ہے۔

مسلسل بولنے کی وجہ سے پروفیسر عثمان کا حلق خشک ہو گیا۔ وہ پانی پینے کے لئے رکے جب کہ ہیڈ ماسٹر صاحب سوچ میں گم بت بنے ہوئے تھے۔

چند ثانیوں بعد سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا، قدیم دور میں ہوس وزر کے پجاریوں نے ایک اور بھیانک ظلم کیا۔ ادیب کی ڈائری میں لکھا ہے کہ دنیا کی آبادی کم کرنے کے لئے ایسے تجربات کئے گئے جن سے مہلک بیماریاں تیزی سے ایک براعظم سے دوسرے براعظم میں پھیل گئیں اور لاکھوں لوگ ہلاک ہو گئے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے پوچھا، کیا قدیم ڈائری میں اس وقت کی آبادی کے بارے میں لکھا ہے؟

جی ہاں! ادیب کی ڈائری پڑھ کر 10 ہزار برس قدیم دور کی ریاضی کو جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، اس وقت دنیا کی آبادی آٹھ ارب تھی۔ اخلاقی، ذہنی، نفسیاتی، مہلک جسمانی بیماریوں اور زمینی و آسمانی آفات سے اموات کی شرح بڑھ گئی۔ اوپر سے محققین نے ایسے تجربات کئے کہ بڑی تعداد میں لوگ ہلاک ہو گئے۔ اٹلانٹس اور دنیا کے مقتدر حلقے لوگوں کے مرنے کا تماشا دیکھتے رہے۔ جب آبادی اڑھائی ارب کے لگ بھگ رہ گئی تو علاج دریافت ہونے کا اعلان کیا گیا۔ ان کی کوشش تھی کہ لوگوں کی ذہنی و فکری نگرانی ہو سکے اور ان کے سوچنے کی طرزوں پر قابو پایا جائے۔

پھر کیا ہوا؟ ہیڈ ماسٹر صاحب نے فوراً پوچھا۔

پھر ایک عظیم زلزلہ آیا اور انہیں ختم کر دیا۔ زلزلہ دنیا کے تمام سمندروں میں آیا تھا۔ پانی سینکڑوں فٹ اوپر آیا اور اٹلانٹس بھی زیر آب آ گیا۔ موجودہ دنیا کے براعظم اس جگہ ہیں جہاں 10 ہزار برس قبل سمندر تھے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب جو حیرت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پوچھا، ادیب کی نجی زندگی، کیا ڈائری میں اس کا تذکرہ ہے؟

جی ہاں —— لیکن نسبتاً کم۔ لگتا ہے کہ یہ انسان دوست ادیب توحیدی مذہب کا پیروکار تھا۔ ڈائری میں بار بار ماورائی ہستی کا تذکرہ کیا ہے جو کائنات کی خالق ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اٹلانٹس براعظم ہونے کے ساتھ وسیع ملک تھا۔ دنیا پر غلبہ قائم رکھنے کے لئے جہاں ٹیکنالوجی کا سہارا لیا، وہاں تمام ممالک میں گماشتے (ایجنٹ) بھیجے اور لوگوں کو نظریاتی اور مذہبی و ثقافتی لحاظ سے الجھا کر بلاوجہ جنگیں برپا کیں۔ تعصب کو فروغ دے کر دنیا کو تقسیم کیا۔ مذاہب کے ماننے والوں کو دست و گریباں کرنے کے لئے فرقے بنائے اور خانہ جنگی کروائی۔

پروفیسر صاحب! یہ تو کمال کی ڈائری ہے۔

آگے سنیں! ڈائری کی ان سطور میں یہ ادیب اپنے دور کی تاریخ واضح طور پر بیان کرتا ہے۔ لکھا

ہے کہ میں جس ملک میں رہتا ہوں، وہاں آبادی توحید کی پیروکار ہے لیکن اصل تعلیمات بھول کر فرقوں میں بٹ گئی ہے۔ مجھ پر دوسرے فرقے والے طعن و تشنیع کرتے ہیں، گم راہ اور دین سے نابلد سمجھتے ہیں۔ ایک مذہب ہونے کے باوجود عبادت خانے الگ ہیں اور اپنے عبادت خانوں سے وہ دوسرے کے خلاف صف آرا رہتے ہیں۔ ان لوگوں نے مظاہرِ قدرت میں تفکر اور سائنس و ٹیکنالوجی سے منہ موڑ لیا ہے، اسلاف کی عظمت کی مالا جاپ رہے ہیں مگر خود علم و حکمت اور رفعتِ کردار سے عاری ہیں۔

اماں فضیلت چائے لے کر آ گئیں۔ انکشافات سن کر ہیڈ ماسٹر صاحب کا دماغ بوجھل ہو گیا تھا۔ شش و پنج میں مبتلا تھے اور مزید سننے کا اشتیاق بھی تھا۔ جس بات نے انہیں پریشانی میں مبتلا کیا، وہ ایسی تھی جسے زبان پر لانے کے لئے الفاظ ترتیب دے رہے تھے۔ اس سے قبل کہ پریشانی کا ذکر کرتے، پروفیسر صاحب نے کہا، چائے پی لیں۔

ہیڈ ماسٹر ریاض بخش نے چائے کا کپ اٹھایا۔ چائے میں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ انہوں نے سوچا کہ جس طرح پانی میں سے بھاپ الگ ہوتی ہے، اسی طرح کسی وجود یا دور میں سے زندگی کی مقداریں نکلتی ہیں اور وہ فنا ہو جاتا ہے۔ (قسط:۱)

## کوتاہ اندیش

صدیوں سے زمین پر ہونے والی تبدیلیاں اس بات کی شاہد ہیں کہ زندگی کے ادوار، زمانے کے نشیب و فراز اور سائنسی ایجادات زمین کے سینے میں محفوظ ہیں۔ زمین یہ بھی جانتی ہے کہ کتنی تہذیبوں نے اس کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور پھر یہ تہذیبیں معدوم ہو گئیں۔ خلا سے اس پار آسمان کی وسعتوں میں جھانک کر دیکھا جائے تو مایوسیوں، ناکامیوں اور ذہنی افلاس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ یوں لگتا ہے کہ زمین کے باسیوں کا اپنی ذات سے فرار اور منفی طرز فکر دیکھ کر نیلے امبر پر جھل مل کرتے ستاروں کی شمعِ امید کی لو مدھم پڑ گئی ہے۔ وہ شخص جو اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، ذہنی اعتبار سے حیوانات سے پست زندگی گزار رہا ہے۔ جو سکون بلی اور بکری کو حاصل ہے اس کا عشر عشیر آدمی کو حاصل نہیں۔ قول و فعل میں تضاد کا یہ عالم ہے کہ ہر آدمی جانتا ہے کہ زمین پر وقفۂ زندگی محدود ہے لیکن وہ تمام زندگی اس خطوط پر گزارتا ہے جو فطرت کے منافی ہے۔ تخریب کا نام اس نے ترقی رکھا ہے اور فلاح و بہبود کے طلسمی نام پر مستقبل کی ناخوشگواریوں کو جنم دیتا ہے۔ روشن نگاہی کا دعویٰ کر کے جو کچھ کرتا ہے وہ بدترین درجے کی کوتاہ اندیشی کے سوا کچھ نہیں۔

شازیہ رشید

# حضرت حمید الدین ناگوریؒ

منفی خیال دوری ہے جو "یقین" سے متعلق بے یقینی پیدا کرتی ہے۔ بے یقین شخص کے اندر گریز کی لہروں کا غلبہ ہوتا ہے اور پُر یقین شخص میں کشش کی لہریں غالب ہوتی ہیں۔

سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتیؒ نے درس و تدریس کی مجلس میں عقیدت مندوں سے فرمایا، اس وقت اجازت کے دروازے کھلے ہیں ۔ کیا مانگنا چاہتے ہو—— ؟ کسی نے دنیا طلب کی اور کسی نے آخرت کی خواہش کی۔

ایک مرید مجلس میں خاموش بیٹھے تھے۔

اس سے پوچھا، تمہیں کچھ نہیں چاہئے ؟

باادب مرید نے عرض کیا،

"مرشد کی خواہش، مرید کی خواہش ہے۔"

سلطان الہند نے تابع داری کے اظہار اور "نفی" کی راہ پر گامزن شاگرد کی بات سن کر فرمایا،

"آج سے حمید الدین، سلطان العارفین ہیں۔"

حضرت حمید الدین ناگوریؒ اجمیر کے قریب مشہور قصبے ناگور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی زندگی ناعاقبت اندیش دوستوں اور دنیا کے ہنگام میں مست گزری۔ والدین خوش حال تھے اس لئے بیٹے کو معاش کی فکر نہیں تھی۔

روایت ہے کہ دوستوں میں بیٹھے تھے، اچانک طبیعت بے چین ہوگئی۔ خاموشی سے اٹھ کر چل دیئے۔ راستے کا پتہ تھا نہ سمت کا تعین۔ نامعلوم شیریں آواز کانوں میں رس گھول گئی۔ آواز مسلسل آرہی تھی۔ کوئی اپنی طرف بلا رہا تھا۔ خود سے بے خود آواز کی سمت قدم بڑھے اور چلتے چلتے اجمیر پہنچے۔ سامنے خانقاہ تھی۔ آواز خاموش ہوگئی۔

اندر تشریف لے گئے۔

ایک بزرگ انہیں دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا،

"حمید الدین! آنے میں دیر کردی۔ ہم کب سے تمہارے منتظر تھے۔"

یہ وہی آواز تھی جو یہاں لے کر آئی تھی۔

حمید الدینؒ نے پوچھا، حضرت ! آپ کو پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ کوئی جان پہچان نہیں۔ کوئی وعدہ نہیں۔ پھر کیسا انتظار؟

خواجہ اجمیریؒ نے فرمایا، سعید بن زیدؓ کے

خاندان سے تعلق رکھتے ہو مگر تمہیں دنیا کی رنگینی مرغوب ہے۔ منتظر تھے کہ اس خاندان کا کوئی فرد کب ہماری طرف آئے گا۔ تمہاری منزل وہ نہیں جن لوگوں میں بیٹھے تھے، تمہاری منزل وہ ہے جہاں ہم لے جائیں گے۔

عرض کیا، حیران ہوں کہ آپ میرے حالات سے کس طرح واقف ہیں۔

خواجہ معین الدین چشتیؒ نے فرمایا،

"جس محفل میں بیٹھے تھے، وہاں سے یہاں کون لایا—؟ خدائے واحد کا حکم ہوا تو اجمیر آنے کے اسباب و وسائل بن گئے۔ اللہ کی مرضی کے بغیر پتّا نہیں ہلتا۔ وہ عالمین کا حاکم اور مالک ہے۔ جو شخص اللہ کی رضا میں سر تسلیم خم کرتا ہے، دنیا اس کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔"

حمید الدین ناگوریؒ نے عرض کیا، حضرت! میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔

سلطان الہند خواجہ معین الدینؒ نے فرمایا،

"دنیا اور اس کے معاملات کو سمجھنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ عقل اور دوسرا عشق ہے۔ عقل کی تعلیم جو کچھ بتاتی ہے اس کی صداقت پر یقین مشکل ہے۔ عشق سے جو حاصل ہوتا ہے وہ صداقتِ عین ہے۔"

گفتگو میں ایسا اثر تھا کہ حمید الدین ناگوریؒ واپس جا کر بے چین رہے۔ اگلے روز دوبارہ حاضر ہوئے۔

خواجہ اجمیریؒ نے فرمایا، حمید الدین! اپنی دنیا میں لوٹ جاؤ اور ایسے آدمی کو تلاش کرو جو سود و زیاں سے مبرّا اور قناعت پسند ہو۔

تلاش میں نکلے۔ کچھ عرصے بعد واپس آئے اور بتایا کہ ایسا کوئی نہیں ملا۔

خواجہ معین الدینؒ نے فرمایا، ایسا شخص صرف فقرا میں ملے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں رہتے ہیں، ان کے پاس سب کچھ ہے مگر ملکیت سے لاتعلق ہیں— اللہ کی رضا کے علاوہ کسی شے کی طلب نہیں رکھتے۔

سلطان الہند کی محفل میں بیٹھنے کے بعد کسی محفل میں دل نہیں لگا۔ باقاعدگی سے اجمیر آنے لگے۔ اجمیر کے دربار سے ایسی وابستگی ہوئی کہ گزشتہ زندگی کو خیرباد کہا۔ پیر و مرشد کی تربیت میں رہ کر تصوف و معرفت کے رازہائے سربستہ کا مشاہدہ کیا۔ تعلیم و تربیت کے بعد سلطان الہند نے انہیں خرقۂ خلافت عطا کیا اور ناگور میں خدمت کا حکم دیا۔ چناں چہ آبائی قصبے روانہ ہوئے۔

دین و دنیا کو ساتھ لے کر چلنا انبیائے کرام کی تعلیم ہے۔ انبیائے کرام کے روحانی علوم کے وارث اولیاء اللہ اس تعلیم پر عمل کرتے ہیں اور عوام میں عوام کی طرح رہتے ہیں۔

حضرت حمید الدین ناگوریؒ نے ہر کام عبادت و ریاضت کی طرح کیا۔ روحانی زندگی کے ساتھ معاشی و معاشرتی ذمہ داریاں پوری کیں۔ ذریعہ معاش کاشت کاری تھا۔

ناگور کے حاکم نے حاضر ہو کر قیمتی تحائف اور نقد رقم پیش کی جو آپ نے شکریہ کے ساتھ یہ کہہ کر قبول کرنے سے معذرت کرلی کہ،

"اللہ میری ہر ضرورت پوری کرتا ہے۔ فقیر کو تحائف کی ضرورت نہیں کہ ان تحائف کی قیمت سکونِ قلب ہے جو میں قربان نہیں کر سکتا۔"

حضرت حمید الدین ناگوریؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خاص مریدین، اور خلفا میں سے ہیں۔ روشن ضمیر ہستیوں کا ذہن منفی خیالات سے پاک ہوتا ہے۔ منفی خیال دوری ہے جو "یقین" سے متعلق بے یقینی پیدا کرتی ہے۔ بے یقین شخص کے اندر گریز کی لہروں کا غلبہ ہوتا ہے اور پُر یقین شخص میں کشش کی لہریں غالب ہوتی ہیں۔

عوام و خواص میں "حمید الدین سوالیؒ" کے نام سے مشہور تھے۔ لوگ دن رات مسائل لے کر حاضر ہوتے۔ آپ سب کی بات سنتے اور مسئلے کا حل پیش کرتے تھے۔

نیک بندوں کے پاس دنیاوی مسائل میں الجھے ہوئے لوگوں کے علاوہ علم سے محبت رکھنے والے لوگ بھی حاضر ہوتے ہیں۔

حضرت ناگوریؒ سے ایک سائل نے پوچھا، اللہ کی مدد کب اور کس طرح ملتی ہے؟

فرمایا، کیا زندگی اللہ کی مدد کے علاوہ بھی ہے؟ اللہ کی مدد تمہیں ہر لمحہ حاصل ہے۔ اپنے وجود اور وسائل پر غور کرو تاکہ یقین پیدا ہو کہ اللہ کیسے کیسے بندے کی مدد کرتا ہے۔ تمہارے سوال کا تعلق ذاتی غرض سے ہے یعنی تمہاری مرضی پوری ہو تو یہ اللہ کی طرف سے مدد ہے۔ سوال یہ ہونا چاہئے کہ اللہ کا قرب کیسے حاصل ہو؟

سائل نے پوچھا، اللہ کا قرب کیسے حاصل ہو؟

فرمایا، اپنے اندر حرکت (زندگی) محسوس کرنے اور شکر ادا کرنے سے قربت حاصل ہوتی ہے۔

خدائے واحد کا فرمان ہے:

"اے آلِ داؤدؑ! شکر ادا کرو کہ میرے بندوں میں شکر ادا کرنے والے کم ہیں۔"

کسی نے پوچھا، محبت میں ملاوٹ کیا ہے؟

حضرت ناگوریؒ نے فرمایا،

"محبت کا دعویٰ کرو لیکن دن میں محبوب سے غافل اور رات اس کی یاد میں بیدار نہ رہو تو تمہارا نام جھوٹوں کے دفتر میں لکھا جائے گا۔"

ایک طالب علم نے پوچھا کہ جب اللہ رگِ جان سے زیادہ قریب ہے پھر نظر کیوں نہیں آتا؟

حضرت ناگوریؒ نے فرمایا، آئینے میں اپنی شکل و صورت دیکھنا چاہتے ہو تو پہلے کیا کرو گے ؟

عرض کیا، پہلے آئینہ صاف کروں گا۔

فرمایا، اگر آئینہ صاف نہیں کرو گے تو دیکھنا محال ہے۔ طلبِ حق کے سلسلے میں جس کے دل کا آئینہ صاف نہیں، وہ گرد و غبار میں گم رہتا ہے اور اس کی باتیں فضول گوئی سے بھرپور ہوتی ہیں۔ طلب کے معانی خود کو فنا اور محو کرنے کے ہیں۔ آئینہ شفاف ہے تو عکس واضح ہوتا ہے۔"

علم یا کسی امر کے بارے میں جاننے کے لئے ذہنی صلاحیت اور سکت کی ضرورت ہے۔ ایک شخص روشنی دیکھتا ہے، دوسرا نہیں دیکھتا۔ اگر وہ کہے کہ دیکھو! روشنی کا ہالہ ہے اور دوسرا پوچھے کہ کہاں؟ مجھے نظر نہیں آرہا، تو یہ سکت کی بات ہے۔ روشنی سامنے ہے، ذہنی سکت بڑھنے سے نظر آتی ہے۔ سکت کی وجہ سے تعلیم کو درجات میں تقسیم کیا جاتا ہے جیسے پہلی، دوسری، پانچویں، دسویں اور سولہویں کلاس پھر پی ایچ ڈی۔ اسی طرح راہِ سلوک میں بھی درجات ہیں۔ حضرت ناگوریؒ فرماتے ہیں:

* پہلا درجہ علم ہے۔ آدمی کو اچھائی اور برائی کا علم نہ ہو تو بھٹکنے کا خطرہ ہے۔
* علم کے بعد عمل ہے۔ عمل کے بغیر علم اور نیت بے معنی ہے۔
* عمل میں صدق و سچائی درکار ہے۔ یہ تیسرا درجہ ہے۔ صدق سے عشق تک رسائی ہوتی ہے۔
* عشق چوتھا درجہ ہے۔ اس مقام پر توجہ راسخ ہوتی ہے اور مرکزیت قائم ہو جاتی ہے۔
* پانچواں درجہ توجہ ہے۔
* توجہ کے بعد سلوک ہے۔
* سلوک سے حضوری کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

حضرت ناگوریؒ کو عربی، فارسی اور ہندی زبان پر عبور تھا۔ مطالعے کا ذوق تھا۔ کئی کتب تصنیف کیں۔ "دیوان حمید" کے نام سے مجموعہ بھی ہے۔

اللہ کے دوست دنیا کو دائمی مقام نہیں سمجھتے، وہ جانتے ہیں کہ کائنات عالمین پر مشتمل ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ دنیا دوری کا مقام ہے۔ اس لئے یہاں سے روانگی کا وقت ان کے لئے خوشی کا لمحہ ہے۔ وہ اس روز کو عرس کہتے ہیں۔ عرس کے معنی خوشی کے ہیں اور خوشی وصال سے ملتی ہے۔

حضرت حمید الدین ناگوریؒ موت کی حقیقت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ جب کوئی مر جاتا ہے تو جان، جسم عنصری سے پرواز کر کے اصل کی طرف لوٹتی ہے۔

آپ کا مزار شہر ناگور میں مرجع خلائق ہے۔

# اقتباسات

"ماہنامہ قلندر شعور" کو گلدستہ بنانے کے لئے قارئین کی کوشش قابل قدر ہے۔ قرآن کریم، آسمانی کتابوں، ملفوظات، تاریخ، انکشافات اور سائنسی فارمولے بھیج کر اس رسالے کا حصہ بن سکتے ہیں۔ تحریر کم و پیش 120 الفاظ پر مشتمل ہو۔

---

انسان کا جسم ایک خول ہے، اس خول کے دو رخ ہیں۔ جسم اور دماغ۔ دماغ کا رخ عالمِ امرِ عام کی طرف ہے۔ اسی کو نسمہ کہتے ہیں لیکن یہ دماغ یا جسم انسان نہیں ہے، انسان ان دونوں کے اندر بستا ہے جس کو تجلی ذات کا ایک نقطہ کہنا چاہئے۔ یہ نقطہ جو ذاتِ انسانی ہے، اس نور کی چادر کا ایک ذرّہ ہے۔ یہ ذرّہ ایک خول رکھتا ہے جس کو جسم کہتے ہیں، یعنی مظہر ہے۔ (مرسلہ: محمد عثمان، کتاب: لوح و قلم)

سکون ظاہر میں نہیں، من میں ہے اور تم اسے دنیا کی رنگینیوں میں ڈھونڈ رہے ہو۔ نادان ہو ظلمت میں ضیا ڈھونڈ رہے ہو۔ سکون کھلی فضا میں ہے اور تم حبس کے موسم میں ہوا ڈھونڈ رہے ہو۔ سکون چڑیوں کی چہچہاہٹ اور درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں ہے، ہر سمت چلتی ہواؤں میں ہے، ایسے میں کہاں بادِ صبا ڈھونڈ رہے ہو۔ جس شہر کے لوگوں کے ہاتھوں میں پتھر ہیں، اس شہر میں وفا ڈھونڈ رہے ہو۔ سکون ظاہر میں نہیں، من میں ہے اور تم نہ جانے کہاں ڈھونڈ رہے ہو۔

(مرسلہ: سارہ نور آصف، اسلام آباد)

مصور اپنی بنائی ہوئی تصویر کا جائزہ اس کے قریب کھڑے ہو کر نہیں لے سکتا۔ اس کو تصویر کے صحیح خدوخال ملاحظہ کرنے کے لئے دور سے دیکھنا پڑتا ہے۔ درمیان میں فصل نہ ہو تو دو کے درمیان فرق نہیں ہو سکتا۔ پہچان دو مختلف وجود کی وجہ سے نہیں، درمیانی فصل سے ہے۔ فصل ختم ہونے سے پہچان ختم ہو جاتی ہے۔ جگ میں پانی کو پانی سے بھری بالٹی میں ملا دو، دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ ایک ہونے میں اہمیت پانی کے بجائے درمیانی فصل کی ہے۔ (مرسلہ: سلمان جاوید، راولپنڈی)

ایک مصنف سے کسی نے پوچھا، زندگی میں سب سے بڑا سبق کیا سیکھا؟ مصنف نے کہا، میں نے سیکھا کہ خیالات و تصورات ہماری شخصیت کا آئینہ دار ہیں۔ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ آپ اس وقت کیا سوچ رہے ہیں تو میں فوراً بتادوں گا کہ آپ کیسے آدمی ہیں۔ قسمت کا تعین ذہنی رجحان سے ہے کیوں کہ آدمی وہی ہے جو وہ تمام دن سوچتا ہے۔

(مرسلہ: ذہین شاکر۔ شارجہ، کتاب: پریشان ہونا چھوڑیئے)

صبر ـــــ فطرت کا قانون اور الہامی تعلیمات کا مرکزی اصول ہے۔ صبر کا مفہوم جذبات قابو میں رکھنا، جلد بازی، گھبراہٹ اور طمع سے بچنا اور ٹھنڈے دماغ کے ساتھ کام کرنا ہے۔ اگر زندگی میں اشتعال انگیز مواقع پیش آئیں تو ہیجان پر قابو رکھتے ہوئے زیادتی کا ارتکاب نہ کرنا بھی صبر ہے۔ صبر کو بسا اوقات لوگ کم زوری پر محمول کرتے ہیں جب کہ صبر پختگی اور مضبوطی کے بغیر ممکن نہیں۔ بے صبری اور غصہ کم زوری کی علامت ہے۔

(مرسلہ: نمرہ سلطان، کتاب: توازن زندگی)

جب ہم سورج کی طرف دیکھتے ہیں تو یہ بھی علم ہے۔ سورج کے بارے میں یہ کہہ کر ہم مطمئن نہیں ہوسکتے کہ سورج سورج ہے۔ سورج اتنا بڑا علم ہے کہ اگر کوئی آدمی کئی صدیوں تک زندہ رہے، تب بھی سورج کے بارے میں اس کا علم محدود رہے گا۔ ایسے ہی چاند ہے۔ چاند جب چڑھتا ہے تو پانی میں جوار بھاٹا آجاتا ہے اور سمندر اچھلنے لگتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ چاند اور سمندر کا آپس میں ایک تعلق ہے جس کی بنیاد پر سمندر میں تلاطم پیدا ہوتا ہے۔ اس ربط کو ہم کیسے ڈھونڈیں گے؟ یہ ایک علم ہے۔ علم حاصل ہو جائے گا تو ہمیں پتہ چل جائے گا کہ چاند کیا ہے۔ یہی حال زمین، آسمان اور کائنات کا ہے۔ جتنا آپ اس علم کو پڑھیں گے اسی مناسبت سے کائنات کے گوشے آپ پر کھل جائیں گے۔ (مرسلہ: دعا جمیل، کتاب: خطبات ملتان)



نمازی جب رکوع میں جھکتا ہے تو حسیں (senses) بنانے کا فارمولا الٹ جاتا ہے یعنی حواس براہ راست دماغ کے اندرونی رخ کے تابع ہو جاتے ہیں اور دماغ یک سو ہو کر ایک نقطے پر اپنی لہریں منعکس کرنا شروع کر دیتا ہے۔ رکوع کے بعد جب نمازی قیام کرتا ہے تو دماغ کے اندر کی روشنیاں دوبارہ پورے اعصاب میں تقسیم ہو جاتی ہیں جس سے انسان سراپا نور بن جاتا ہے۔

(مرسلہ: نورین، پشاور، کتاب: روحانی نماز)

مجتبیٰ حسین

# دارِ فانی کے چالیس سال

چہل قدمی امیر اور غریب دونوں کرتے ہیں۔ غریب چہل قدمی کرتا ہے تو پیروں کی مدد لیتا ہے۔ امیر آدمی کی چہل قدمی مختلف ہوتی ہے۔

جو آدمی انتالیس برس تین سو چونسٹھ دن تک مسلسل زندہ رہے اس کے بارے میں آسانی سے پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن چالیس برس کا ہو جائے گا۔ سو ہمارے بارے میں بھی یہ پیشین گوئی درست ثابت ہوئی اور ایک دن ہم چالیس برس کے ہوگئے۔ جی ہی جی میں بہت خوش ہوئے کہ زندگی کے چالیس برس بیت گئے اور اب وہ زمانہ آیا ہے جب زندہ رہنے کی ''مشق'' اور ''مہارت'' ہوگئی ہے اور یہ کہ اس مشق کے سہارے باقی زندگی آرام کے ساتھ گزرے گی کیوں کہ زندگی میں جو کچھ ہوتا ہے، چالیس برس سے پہلے ہو جاتا ہے۔ بعد میں آدمی گزری ہوئی زندگی پڑھنے میں مصروف رہتا ہے۔

ہم دن بھر خوش رہے کہ زندگی کے سارے ہنگامے اور معرکے تمام ہوئے، اب چین کی بنسی بجانا ہے۔ رات اچھی نیند سو گئے لیکن صبح اٹھے تو سر میں شدید درد تھا۔ بھاگے بھاگے ڈاکٹر کے پاس گئے۔ ڈاکٹر نے تفصیلی معائنے کے بہانے ہمیں لفافے کی طرح خوب الٹ پلٹ کر دیکھا پھر پوچھا، آپ کی عمر کیا ہے؟

چالیس برس پورے ہونے کے بعد یہ پہلے شخص تھے جنہوں نے عمر پوچھی۔

خوشی خوشی کہہ دیا کہ جناب! کل دارِ فانی میں ہمیں چالیس برس پورے ہوگئے ہیں۔

کہنے کے بعد پتہ چلا کہ ڈاکٹروں کو چالیس کے ہندسہ سے الرجی ہے۔ عمر سنتے ہی کان کھڑے کئے اور بولے — کیا کہا! آپ چالیس برس کے ہوگئے! یہ تو بہت بری بات ہے۔

ہم نے کہا، ڈاکٹر صاحب! جو آدمی انتالیس برس تین سو چونسٹھ دن تک زندہ رہے اسے چالیس برس کا تو ہونا ہے۔ اس میں بری بات کیا ہے۔

بولے، یہی تو وہ عمر ہے جہاں سے آدمی ''آدھا اِدھر'' اور ''آدھا اُدھر'' ہو جاتا ہے۔ زندگی میں جھٹپٹے کا یہ وقت بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ اچھا میری

فیس کے دو ہزار روپے رکھ دیجئے۔

ہم نے کہا، دو ہزار روپے! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ کی فیس تو ہزار روپے ہے۔ دو ہزار کس خوشی میں لے رہے ہیں؟

بولے، بھائی صاحب! جب گاڑی کا ماڈل پرانا ہو جاتا ہے تو مرمت کی فیس زیادہ لی جاتی ہے۔

پھر ہماری توند کی طرف اشارہ کیا، یہ جو آپ آپے میں سما نہیں رہے، اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کی روح قفس عنصری کو توڑ کر پیٹ کے راستے سے باہر آنے کے لئے بے چین ہے اور یہ علامت جسم و صحت کے لئے خطرناک منزل ہے اس لئے پیٹ پر قابو رکھئے ورنہ،

سب ٹھاٹ پڑا رہ جاوے گا
جب لاد چلے گا بنجارا

ڈاکٹر صاحب نے اردو شاعری کی مدد سے ہمیں خوف زدہ کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

ہم نے ڈرتے ڈرتے کہا، مگر ڈاکٹر صاحب! توند تو خوش حالی کی علامت ہے۔

وہ بولے، اسی علامت کی وجہ سے تو میں دو ہزار روپے بطور فیس لے رہا ہوں۔

پھر سیدھے ہاتھ سے ہمارے پیٹ کو تھپتھپاتے ہوئے بولے، قبلہ! زندگی میں وہ منزل بھی آتی ہے جب آدمی غائب ہو جاتا ہے، توند باقی رہ جاتی ہے۔ آخر میں توند بھی مر جاتی ہے اور لوگ غلطی سے سمجھتے ہیں کہ آدمی مر گیا ہے۔ مشورہ ہے کہ توند کم کریں اور توند کم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہر روز صبح کھانے سے پہلے اور رات میں کھانے کے بعد چہل قدمی کیجئے۔

ہم مرجھائے ہوئے دل سے دو ہزار روپے میز پر رکھ کر کلینک سے لوٹے۔

دوسرے دن سے چہل قدمی کا ارادہ کیا۔ اس سے پہلے لغت کھول کر چہل قدمی کے لغوی معنی تلاش کئے۔ اس کے معنی تلاش کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ یہ لفظ موجودہ دور کی اصطلاح اور تہذیب و تمدن کی ترقی کی پیداوار ہے۔

قدیم آدمی پیدل چلتا تھا تو قدموں کا حساب نہیں رکھتا تھا بلکہ بے دریغ چلتا تھا، ہماری طرح "چالیس قدم" چل کر ریاضی کے چکر میں نہیں پڑتا تھا۔ چہل قدمی کی ضرورت اس وقت پیش آئی جب آدمی نے اپنی سہولت کی خاطر سواری اور کرسی ایجاد کی اور پیدل چلنے کو خود پر جرم کر لیا۔ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ جسم میں چربی بھی ترقی کرتی رہی۔ بہت وقت کے بعد ڈاکٹروں کو پتہ چلا کہ یہ سب اس لئے ہو رہا ہے کہ آدمی پیدل نہیں چلتا۔ لہٰذا طبی مشورے کی بنا پر اب وہ پیدل چلتا ہے اور "چہل قدمی" کو ایک

آرٹ بنالیا ہے۔

ہم نے چہل قدمی کے میدان میں قدم رکھا تو دیکھا کہ یہاں ایک سے بڑھ کر ایک شخص ہے جو چہل قدمی کم اور چلنے کے فن کا مظاہرہ زیادہ کرتا ہے۔ مثلاً ایک صاحب کی چھڑی ان سے زیادہ چہل قدمی کرتی ہے۔ وہ ہر قدم کے بعد چھڑی فضا میں لہرا کر زمین پر ٹیکتے ہیں پھر سارا وزن چھڑی پر ڈال کر ایک پاؤں اٹھاتے ہیں اور آگے رکھتے ہیں۔ چھڑی پھر فضا میں لہراتی ہے اور دوسرے پاؤں کو آگے بڑھنے کا موقع عنایت ہو جاتا ہے۔

اس طرح کی چہل قدمی کا ایک فائدہ یہ ہے کہ چلنے والے کے پاؤں کو معمولی سا بھی صدمہ نہیں پہنچتا البتہ دوسرے تیسرے مہینے چھڑی دو میں تقسیم ہو جاتی ہے۔

علی الصبح چہل قدمی کے وقت ایک اور صاحب ملتے ہیں جن کا کتّا آگے اور وہ اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ پتہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ کتّے کے مالک ہیں یا کتّا ان کا مالک ہے۔ ان صاحب کا کام اتنا ہے کہ وہ کتّے کے گلے میں زنجیر مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور جدھر کتّا جائے، پیچھے چل پڑتے ہیں۔ ہم اسے چہل قدمی کا نام نہیں دیتے۔ کیوں نہیں دیتے؟ اس پر غور کیجئے۔ وجہ سمجھ میں نہ آئے تو علی الصبح چہل قدمی کیجئے۔ کم و بیش یہی منظر ملے گا اور وجہ سمجھ میں آجائے گی۔

سلام دعا ہو چکی تھی اس لئے ایک دن باتوں باتوں میں انہیں سمجھایا کہ یہ جو آپ خود سے زیادہ طاقت ور کتّے کے ساتھ چہل قدمی کے لئے نکلتے ہیں، مناسب نہیں کیوں کہ اس پورے عمل میں چہل قدمی کے طبی فوائد سے کتّے نے فائدہ اٹھایا ہے اور آپ منہ دیکھتے اور دم ہلاتے رہ جاتے ہیں۔ صحت دن بدن گر رہی ہے البتہ کتّا توانا ہو گیا ہے۔

انہوں نے وسعتِ قلبی کا مظاہرہ کر کے بات سنی پھر بولے، بھائی! میں تو چہل قدمی کتّے کی وجہ سے کرتا ہوں۔ یہ مجھے کھینچ کر لے جاتا ہے ورنہ عرصہ ہوا، چلنے کی عادت بھول چکا ہوں۔

چہل قدمی کے انداز ہیں جن سے افتادِ طبع ظاہر ہوتی ہے۔ ایک اور صاحب کا قصہ پڑھئے جن کا انداز نرالا ہے۔ وہ پارک میں مخصوص جگہ پر پہنچ کر بیس فٹ کے طول میں ادھر سے ادھر چہل قدمی شروع کر دیتے ہیں۔ پارک وسیع ہے مگر یہ بیس فٹ کی طوالت سے آگے نہیں جانا چاہتے۔ آدھے منٹ میں فاصلہ طے کر کے اسی راستے سے پلٹ آتے ہیں اور دوسرے سرے پر پہنچ کر الٹے پاؤں واپس ہو جاتے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم اس سے صحت پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں البتہ ان کی چہل قدمی سے پارک کی صحت پر برا اثر پڑا ہے۔

جس جگہ پر یہ چلنے کے عادی ہیں، وہاں کم از کم ایک فٹ گہری ''پگڈنڈی'' نمودار ہو گئی ہے۔ روش کچھ عرصہ جاری رہی تو اندیشہ ہے کہ پگڈنڈی میں سے پانی کے جھرنے نہ نکل پڑیں۔

چہل قدمی امیر اور غریب دونوں کرتے ہیں۔ غریب چہل قدمی کرتا ہے تو پیروں کی مدد لیتا ہے، امیر آدمی کی چہل قدمی مختلف ہوتی ہے۔ ہمارے ایک لکھ پتی دوست چہل قدمی کے لئے نکلتے ہیں تو پیچھے پیچھے قیمتی گاڑی بھی چلتی ہے کہ جب تھک جائیں تو گاڑی میں سوار ہو جائیں۔

ایک اور دوست چہل قدمی کے لئے نکلتے ہیں تو نوکر چھڑی پکڑے رہتا ہے۔ دوسرا نوکر دودھ کا پیالہ ہاتھ میں لئے ساتھ چلتا ہے اور تیسرا نوکر راستے میں سے پتھر ہٹاتا ہے۔

بڑے لوگوں کی چہل قدمی کی شان الگ ہے۔ کسی محکمے کے ڈائریکٹر کو ڈاکٹر نے صبح صبح چہل قدمی کا مشورہ دیا۔ مشورے پر عمل کیا۔ رفتہ رفتہ اسٹاف کو خبر ہو گئی۔ محکمے کے ڈپٹی ڈائریکٹر بھی پارک میں چہل قدمی کے لئے آنے لگے۔ جب اسسٹنٹ ڈائریکٹروں کو پتہ چلا تو وہ بھی کارِ خیر میں شامل ہوئے۔ بعد میں آفس کے غرض مند لوگوں کو بھی جسمانی فٹنس کے لئے چہل قدمی کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ پارک کو دفتر میں تبدیل ہوتا دیکھ کر ڈائریکٹر کو چہل قدمی ترک کرنا پڑی۔

کہتے ہیں کہ اچھی صحت کے لئے دن میں چھ ہزار جب کہ وزن کم کرنے کے لئے 10 ہزار قدم چلنا ضروری ہے۔ 2017ء میں کی گئی تحقیق کے مطابق دنیا کے چست ترین لوگوں میں ہانگ کانگ 6880 قدموں کے ساتھ پہلے اور چین 6189 قدموں کے ساتھ دوسرے نمبر پر رہا۔

سچ ہے کہ آدمی سماجی جانور ہے۔ ہمیشہ ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے جس کے ساتھ دنیا بھر کے مسائل پر تبادلۂ خیال کرے۔ لہٰذا جب آپ چہل قدمی کا ارادہ کرتے ہیں تو چند دنوں تک پابندی سے عمل کرتے ہیں۔ بعد میں دیگر لوگوں سے خود بخود تعارف ہو جاتا ہے۔ پھر پانچ دس چہل کرنے والے ایک جگہ جمع ہو کر ''حالاتِ حاضرہ'' پر تبادلۂ خیال میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ یہیں سے آپ کو تیل کی رائج الوقت قیمت، سبزیوں کے تازہ ترین بھاؤ اور حالاتِ حاضرہ کی اطلاعات ملتی ہیں۔

ہم ایک برس سے پابندی کے ساتھ چہل قدمی کے لئے جا رہے ہیں۔ پتہ نہیں ہماری صحت پر کیا اثر پڑا ہے لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ معلومات عامہ بہتر ہو گئی ہیں اور اب تو ہم نے اخبار خریدنا اور پڑھنا ترک کر دیا ہے۔

عابد محمود

# ہم نماز میں کہاں ہوتے ہیں؟

وقت اور ہمارا گہرا رشتہ ہے۔ ہم کسی کو وقت کے سوا کچھ نہیں دے سکتے۔ قدرت ہمیں جگہ جگہ اس لئے لے کر جاتی ہے کہ ہم جس وقت جہاں پر ہیں، وہ ہماری ذمہ داری ہے۔ تمہارا حال یہ ہے کہ ہر جگہ درزی کی دکان ساتھ لئے پھرتے ہو۔

---

اللہ اکبر ـــــ تکبیر کی صدا بلند ہوتے ہی میں ہاتھ کانوں تک لایا اور دل میں اللہ اکبر کہتے ہوئے ہاتھ باندھ کر قیام میں چلا گیا۔ لمحے کے لئے اللہ کی طرف متوجہ ہونے کے بعد تواتر سے دن بھر کی مصروفیات ذہن میں آئیں اور دکان کی فلم چلنے لگی۔ ذیشان صاحب کا سوٹ تیار نہیں ہے، ان کے گھر میں آج تقریب ہے۔ کام زیادہ ہے اور کاریگر نے بتائے بغیر چھٹی کر لی ہے۔ غصے کی لہر اٹھی، بے بسی کا احساس ہوا جو شکوہ بن گیا کہ پتہ نہیں اللہ نے میرے نصیب میں درزی بننا کیوں لکھ دیا۔

خیال کے ساتھ ہی ماضی کا وہ منظر سامنے آیا جب میں ابا سے کہہ رہا تھا کہ مجھے سلائی نہیں کرنی لیکن ابا نے ایک نہ سنی۔

ابا کے بعد بچپن کے دوست پر رشک آیا جو جرمنی چلا گیا تھا۔ ساتھ گزرے لمحات کی یاد تازہ ہو گئی۔ وہ دوست بھی یاد آئے جن کے بغیر وقت گزرنا مشکل تھا، ایسے غائب ہو گئے جیسے ملے نہ ہوں۔ شاید بہت مصروف ہیں۔ مصروفیت کا خیال آتے ہی دوبارہ دکان پر پہنچا۔ خرچے بڑھ گئے تھے اور کاریگر سلائی کے نرخ میں اضافے کا تقاضا کر رہے تھے۔ میں تلملایا کہ لوگوں کی قوتِ خرید کم ہو رہی ہے، پیسے کیسے بڑھا دوں؟ جہاں دو سوٹ بنتے ہیں، ایک بنے گا یا لوگ سلے سلائے جوڑے خریدنے کو ترجیح دیں گے۔ فلم ایسے چل رہی تھی جیسے ہر واقعہ دوسرے سے جڑا ہو۔ ذہن میں خیالات کی رو چلتی ہے تو جال کی طرح پھیل جاتی ہے اور ایک خیال کہاں سے کہاں لے جاتا ہے۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

آواز کے ساتھ خیالات کی دنیا سے باہر آیا۔ پتہ نہیں چلا کہ نماز کب شروع ہوئی، رکوع و سجود کب ہوئے، قیود میں کس وقت بیٹھا اور سلام ہو گیا۔

دعا کے بعد مسجد سے باہر آ کر عجلت میں جوتا

تلاش کیا اور تیز قدموں سے دکان کا رخ کیا۔

بیٹا! کہاں سے آرہے ہو؟ چاچا سمیع اللہ نے مجھے تیزی سے جاتا ہوا دیکھ کر آواز دی۔

چاچا! مسجد سے آرہا ہوں۔ سرسری جواب دیا۔

نہیں بیٹا! تم دکان سے آرہے ہو۔ بندہ وہاں ہوتا ہے جہاں توجہ ہوتی ہے۔ کبھی اللہ کے حضور بھی حاضری دیا کرو۔ چاچا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا، دکان آگے اور مسجد پیچھے ہے۔

ارے نادان! سمتوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں تو دیکھ رہا ہوں کہ تم دکان سے آرہے ہو اور اب وہ کام کرنے جارہے ہو جو تمہارے لئے اہم ہے۔

چاچا کی بات نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔

پاپا! کلاس میں دوسرے نمبر پر آیا ہوں۔

بیٹے نے رزلٹ کارڈ سامنے رکھتے ہوئے پُرجوش لہجے میں کہا۔ میں نے گلے لگایا اور مارکس شیٹ دیکھی۔ میرا بیٹا بہت ذہین ہے۔ یہ بتاؤ کہ کلاس میں کوئی فیل ہوا ہے؟

اس نے دائیں بائیں سر ہلاتے ہوئے کہا، نہیں! سب طالب علم اگلی کلاس میں چلے گئے ہیں۔

اس لمحے خیال وارد ہوا کہ جب طالب علم سیکھتا ہے تو آہستہ آہستہ علم کی وسعتوں میں سفر کرتا ہے اور شعوری سکت بڑھتی ہے۔ طالب علم ہر سال اگلی کلاس میں جاتا ہے، ہنر مند نئی طرزوں سے واقف ہوتا ہے اور میں ہوں کہ پہلے دن سے جو نماز پڑھ رہا ہوں، اب تک وہیں ہوں۔ کیا نماز اپنے اندر وسعت نہیں رکھتی یا میں نماز سے ناواقف ہوں؟

اماں کی نصیحت تھی کہ نماز قضا نہیں کرنا۔ میں وقت پر نماز پڑھتا تھا۔ پھر کیوں نماز پڑھتے ہوئے آج بھی وہیں ہوں جہاں پہلے دن تھا؟

آگہی نے مجھ پر انکشاف کیا کہ تم وہ طالب علم ہو جو نماز کی وسعت سے واقف نہیں، محض ثواب کی نیت سے پڑھتے ہو۔

جن نمازیوں سے سلام دعا تھی، اگلے روز ان سے پوچھا کہ جب سے آپ نے نماز پڑھنی شروع کی ہے، اس وقت اور آج نماز پڑھتے ہوئے فرق محسوس ہوتا ہے؟

حیرت سے بولے، نماز میں کیا فرق ہونا ہے۔ پہلے دن جو نماز پڑھتے تھے، وہی آج پڑھ رہے ہیں۔ نماز تو نماز ہوتی ہے۔ نماز پڑھنے کا طریقہ نہیں بدلتا۔ پڑھنے سے ثواب ملتا ہے۔

میں نے وضاحت کی کہ میں طریقے کی بات نہیں کر رہا۔ حدیث مبارک ہے کہ ”نماز مومن کی معراج ہے“۔ تم لوگوں نے نماز پڑھنے کے بعد اپنے اندر کوئی تبدیلی محسوس کی؟

دوستوں کی حیرت مسکراہٹ میں تبدیل ہوگئی وہ بولے، لگتا ہے آج کل دل نماز میں نہیں لگ رہا اور حجت تلاش کر رہے ہو۔ سب شیطانی وسوسہ ہے۔ یہی وقت ہے خود کو نماز پر قائم رکھنے کا۔

میں خاموش رہا۔

جب ہر علم وسعت رکھتا ہے پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ نمازی کا ذہن، نماز کی وسعت یعنی مرتبۂ احسان سے واقف نہ ہو؟ یہ تو ایسی بات ہے کہ بچہ ساری زندگی پہلی کلاس میں رہے اور ذہن دوسری کلاس میں جانے کے قابل نہ ہو۔ مرتبۂ احسان یہ ہے کہ ''بندہ تصور کرے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے یا میں اللہ کے حضور حاضر ہوں۔'' اللہ تعالیٰ نے انسان کی ساخت ایسی بنائی ہے کہ انسان جس شے کی طرف متوجہ ہوتا ہے، رموز کھلتے ہیں۔

مجھے اپنی نماز یاد آگئی۔ چاچا نے ٹھیک کہا تھا کہ میں دکان سے آرہا ہوں اور عبادت کرنے جارہا ہوں کیوں کہ میں نے نماز عبادت کی طرح ادا نہیں کی۔ سلائی کرتے ہوئے میں یکسو رہتا ہوں۔ فکر ہوتی ہے کہ کپڑا غلط کٹے گا یا سلائی ٹیڑھی لگ جائے گی۔ قمیص کے کپڑے سے شلوار اور شلوار سے قمیص بن جائے گی اور گاہک ناراض ہو گا۔ ناراض ہو گا تو پیسے نہیں دے گا یا کہیں اور چلا جائے گا۔ نماز میں توجہ تقسیم ہونے کی فکر نہیں تھی کیوں کہ میں نے کبھی نہیں سوچا کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔

مسجد سے نکل کر ان خیالات میں محو چاچا سمیع اللہ کی دکان کے پاس سے گزرا تو کسی نے پکارا،

اللہ کے نام پر دیتا جا۔

جیب میں سے دس کا نوٹ تلاش کرنے لگا۔

چاچا مجھے جیب ٹٹولتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

آواز دی، تم جہاں ہو، وہاں کیوں نہیں ہوتے؟

غصہ آیا کہ یہ مجھے غائب دماغ سمجھتے ہیں۔ ناگواری چھپاکر انہیں نظر انداز کیا۔ واسکٹ کی اندر والی جیب میں پانچ کے دو سکّے مل گئے۔

اس دوران ایک بچہ اسکول یونیفارم میں ملبوس گلے میں بیگ ڈالے ہمارے قریب سے گزرا تو چاچا بولے، بچہ کلاس میں توجہ سے سبق نہ پڑھے تو اگلی کلاس میں نہیں جاتا۔

میرے قدم رک گئے۔ یہی سوال تو میں نے بیٹے سے کیا تھا کہ کلاس میں سارے بچے پاس ہوگئے یا کچھ رہ گئے۔

وہ بولے، سادہ سی بات ہے توجہ نہ ہو تو علم نہیں ملتا۔ مسئلہ یہ ہے کہ تم جہاں ہو، وہاں نہیں ہوتے۔

میں آپ کے سامنے ہوں۔ تذبذب سے کہا۔

پتر! یہ تو تمہارا لباس ہے جو مرنے کے بعد مٹی میں مل جائے گا اور تم کہیں اور منتقل ہو جاؤ گے۔ تلاش کرو کہ تم کون ہو۔

چائے والا آیا اور دکان کی میز پر کپ رکھا۔

چاچا نے پوچھا، چائے پیو گے ؟
میں شکریہ ادا کر کے آگے بڑھ گیا۔

ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ میں یہاں نہیں تو کہاں ہوں۔ کسی نے کندھا ہلایا اور سوچ کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ یہ میری بیوی تھی۔
دو مرتبہ آواز دے چکی ہوں۔ آپ کہاں ہیں؟
یا اللہ! سب یہی پوچھ رہے ہیں۔
یہیں ہوں۔ تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔
اس نے اکتاہٹ سے کہا، دو مرتبہ کہہ چکی ہوں کہ کریانے کی دکان سے سودا لا دیں۔
تم نے کب آواز دی۔ حیرت سے پوچھا۔
میرا خیال ہو گا تو آواز بھی آئے گی۔ گھر آ کر بھی پتہ نہیں کہاں ہوتے ہیں۔ لگتا ہے دیواروں سے باتیں کرتی ہوں۔
تعجب سے دیکھتے ہوئے کہا، سارا دن یہیں تھا۔ دکان سے گھر آتا ہوں اور گھر سے دکان جاتا ہوں پھر بھی شکوہ کرتی رہتی ہو۔
اس کو گھر میں ہونا نہیں کہتے۔ صبح سے محسوس کر رہی ہوں کہ آپ کہیں گم ہیں۔
میں نے بات ٹالتے ہوئے کہا، اچھا بتاؤ کیا لے کر آنا ہے کریانے والے سے۔
اس نے پرچی ہاتھ میں تھما دی۔
باہر نکلنے سے پہلے بیوی کا موڈ ٹھیک کرنے کے لئے کہا، آئس کریم لے آؤں؟
مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔
آج چھٹی تھی۔ سوچا تھا کہ دن بیگم کے ساتھ گزاروں گا۔ پھر بھی اس کو شکایت ہے کہ میں گھر پر ہو کر بھی اس کے ساتھ نہیں ہوتا۔ چاچا کی بات یاد آئی، تم جہاں ہو، وہاں کیوں نہیں ہوتے ؟ کیا میرا کسی جگہ پر ہونا، میری توجہ کی بنا پر ہے۔ چاچا کہہ رہے تھے کہ مادی جسم محض لباس ہے۔ ہم وہاں ہوتے ہیں، جہاں توجہ ہوتی ہے۔
شکور بھائی! یہ سودا دینا۔ کریانے کی دکان پر سودے کی پرچی پکڑائی۔
عارف بھائی! گلی میں گٹر کا پانی ابل رہا ہے۔ یہ لوگ کب صفائی کریں گے ؟
میں نے گلی کی طرف دیکھا تو سر گھوم گیا۔ جگہ جگہ گٹر کا پانی تھا جس سے بے خبری میں خود کو بچاتے ہوئے دکان تک پہنچا تھا۔ میں جہاں ہوں، وہاں نہیں ہوتا اور وہ کون ہے جو مجھے گندے پانی سے بچا کر کریانے کی دکان تک لایا؟
ذہن پر زور دیا کچھ یاد نہیں آیا البتہ وہ باتیں یاد تھیں جن میں ذہن کھویا ہوا تھا۔ کیا میں ایک وقت میں دو جگہ پر ہوتا ہوں؟

اللہ اکبر ـــــ
تکبیر سن کر ہاتھ کانوں تک لایا پھر ہاتھ باندھ

لئے۔ ابھی مولوی صاحب نے سورہ فاتحہ شروع کی تھی کہ میں مسجد سے نکل کر دکان پر پہنچ گیا۔ وہاں سے کہیں اور گیا اور وہاں سے کہیں اور ۔ ذہن ادھر ادھر کے معاملات میں بھٹکتا رہا۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

سلام کی آواز سن کر ذہن مسجد میں واپس آ گیا۔

ہر نماز میں یہی ہوتا تھا۔

بائیں جانب بیٹھے ہوئے بچے نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور آہستہ آواز میں ''سورہ ماعون'' پڑھی۔

وہ درج ذیل آیت پر پہنچا تو میں لرز گیا۔

'' ہلاکت ہے ان نمازیوں کے لئے جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔''

پہلی بار احساس ہوا کہ میں ان لوگوں میں شامل ہوں جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔ نماز میں اللہ کے سامنے حاضر ہونے کے باوجود حاضری سے بے خبر ہوں۔ اس سے بڑھ کر ہلاکت کیا ہو گی۔

گم سم مسجد سے باہر آیا۔ آج میں نے دکان کی طرف جانے میں جلدی نہیں کی۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے چاچا سمیع اللہ کی دکان کے آگے رک گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے، حال چال پوچھا اور اندر آنے کی دعوت دی۔ میں دکان میں چاچا کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

انہوں نے پوچھا، تمہیں جوتے گانٹھنے کا خیال یا بینک میں منیجر لگنے کا خیال کیوں نہیں آتا؟ ہر وقت کپڑے سینے کے بارے میں سوچتے ہو۔

ندامت سے کہا، درزی درزی ہے، موچی موچی ہے، بڑھئی بڑھئی ہے اور منیجر منیجر ہے۔ سب کو اپنی ذمہ داری سے متعلق خیال آتا ہے۔

وہ بولے، ہاں! اور یہ ذمہ داری اس لئے عائد ہوئی ہے کہ سب نے مخصوص ہنر کو وقت دیا۔ جس مناسبت سے علم و فن یا مصروفیت کو وقت دیا جاتا ہے، صلاحیتیں اجاگر ہوتی ہیں۔ وقت اور ہمارا گہرا رشتہ ہے۔ ہم کسی کو وقت کے سوا کچھ نہیں دے سکتے۔ قدرت ہمیں جگہ جگہ اس لئے لے کر جاتی ہے کہ ہم جس وقت جہاں پر ہیں، وہ ہماری ذمہ داری ہے۔ تمہارا حال یہ ہے کہ ہر جگہ درزی کی دکان ساتھ لئے پھرتے ہو۔

پوچھا، میرے معمولات کب ٹھیک ہوں گے؟

انہوں نے کہا، جب صلوٰۃ کے مفہوم سے واقف ہو جاؤ گے۔ کئی کام کرنے کے بعد بھی ایک خیال ایسا ہوتا ہے جس کی طرف فرد بار بار پلٹ کر آتا ہے۔ تم نے دکان کو مرکزیت دے دی اس لئے وسوسوں میں رہتے ہو۔ ایسے خیال میں قائم رہو جو تمہیں اندیشوں سے نکال کر حال میں لائے اور یقین سے قریب کر دے اور بیٹا! میرے نزدیک وہ نماز ہے۔ نماز سے واقف ہونے کے لئے اسے زندگی پر محیط کر دو۔ پھر ہر چیز ترتیب میں آجائے

گی اور کوئی نہیں پوچھے گا کہ تم کہاں ہو۔

اللہ اکبر ــــ

ہاتھ کانوں تک لے گیا پھر ایک غلام کی طرح ہاتھ باندھ کر اپنی دانست میں پروردگار کے حضور حاضر ہوا۔ مجھے لگا کہ میں سچ مچ حاضر ہوں۔ میں نے یار دلدار سے سرگوشی کی اور محبت سے معمور دل سے نماز میں پڑھنے والی آیات پر ذہن مرکوز کر دیا۔ آیات کا ترجمہ یاد نہیں تھا اس لئے سوائے ایک دو سورتوں کے ناواقف رہا کہ کیا پڑھ رہا ہوں۔ رکوع میں دل سے اس کی بارگاہ میں جھک گیا اور جب سر سجدے میں رکھا تو آنکھیں نم ہو گئیں اور دل بدل گیا۔ بعد میں نماز میں پڑھی جانے والی آیات کے ترجمے یاد کئے جس سے نماز میں دلچسپی بڑھ گئی اور دل کو سکون ملا۔

اللہ کی توفیق سے میری نماز معراج کے سفر پر گامزن ہو چکی ہے اور منزل پر پہنچنے کی طلب میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ نماز کو اس کی روح کے ساتھ ادا کرنے کی کوشش سے زندگی کے سارے معاملات ترتیب میں آگئے ہیں اور میں جان گیا ہوں کہ نماز ضابطۂ حیات ہے۔ اور یہ کہ نماز کی طرز کو زندگی کی طرزوں میں قائم کر دیا جائے تو ہر کام عبادت بن جاتا ہے۔

وہ دل ملا ہے جس میں دو عالم کی دید ہے

اللہ رے فیض ایک جہاں مستفید ہے
ہر مست میرے پیر مغاں کا مرید ہے

واعظ عبث یہ ذکر عذاب شدید ہے
اک توبہ قفل رحمت حق کی کلید ہے

وحشت نے ہم کو جامۂ خاکی پہنا دیا
اے عقل اب یہ کاہے کی قطع و برید ہے

اے رہروان جادۂ الفت بڑھے چلو
یہ کس نے کہہ دیا ہے کہ منزل بعید ہے

کیونکر نہ قرب حق کی طرف دل مرا کھنچے
گردن اسیر حلقۂ حبل الورید ہے

اب جامِ جم کی مجھ کو ضرورت نہیں رہی
وہ دل ملا ہے جس میں دو عالم کی دید ہے

ہلکی سی اک خراش ہے قاصد کے حلق پر
یہ خط جواب خط ہے کہ خط کی رسید ہے

خنجر بکف وہ کہتے ہیں اب آئے سامنے
کس کو خیال وصل ہے ارمان دید ہے

مجھ خستہ دل کی عید کا کیا پوچھنا حضور
جن کے گلے سے آپ ملے ان کی عید ہے

تو دیکھے اور بندے پہ تیرے عذاب ہو
یارب یہ تیری شان کرم سے بعید ہے

(کلام: بیدم شاہ وارثی)

عثمان طاہر

# خلوص

نفرت، نفرت سے دور نہیں ہوتی ـــــ محبت سے دور ہوتی ہے۔ دوست بدظن یا بددل ہو گیا ہے تو فوراً اپنے دل سے منفی جذبات ختم کریں اور سچے دل سے اس کی جانب محبت کا خیال پیدا کریں۔ کچھ روز کے عمل سے دوست کا غبار، محبت میں تبدیل ہو جائے گا۔

زندگی میں کامیابی کا راز خلوص ہے ـــــ خلوص خود کو غیر سے خالی کر کے حاصل ہوتا ہے۔ آپ سوچیں گے خود کو غیر سے خالی کرنا کیسی بات ہے۔ ہم دینِ فطرت پر پیدا ہوتے ہیں اور فطرت میں ہر شے مرکز پر قائم ہے۔ جب شے مرکز سے جسمانی طور پر دور ہوتی ہے تو یہ دوری شمار نہیں ہوتی، ظاہر میں فاصلہ ہوتے ہوئے بھی مرکز کے گرد گھومتی ہے۔ سورج ایک مقام سے طلوع ہو کر دوسرے مقام پر غروب ہوتا ہے مگر مدار سے نہیں نکلتا۔ دن اور رات طویل کیوں نہ ہوں، بالآخر وہیں لوٹ جاتے ہیں جہاں سے ظاہر ہوئے تھے۔ نظر آتا ہے کہ دن مرکز سے دور ہو رہا ہے لیکن شام بتاتی ہے کہ دن دور ہو کر بھی ماخذ کی طرف سفر کرتا ہے۔ وہ اس نقطہ میں سمٹ گیا جہاں سے روشن ہوا تھا۔ یہ دوری کے بجائے قربت کا سفر ہے۔ یہ مشاہدہ فطرت کے سارے نظاروں میں ہے۔ اس کو غیر سے خالی ہونا کہتے ہیں۔

روحانیت میں سالک کی تربیت کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس فطرت پر پیدا کیا ہے اس پر قائم ہو جاؤ۔ بالآخر تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا ہے۔ صوفیائے کرام نے اسے ”کیئر آف اللہ طرز فکر“ کا نام دیا ہے جو خلوص کی تعریف ہے۔

خلوص طرزِ زندگی ہے کہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے جو کام کریں، ذہن اللہ کی طرف ہو۔

روحانی سفر میں ریاضت کے بعد بھی بہت سے طالب علموں کی ترقی نہیں ہوتی۔ وہ مایوس ہو جاتے ہیں یا بددل ہو کر روحانی کوچے کو خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ اللہ کسی کی محنت رائگاں نہیں کرتا۔ کامیابی نہیں ملی تو اپنے اندر جھانکنا چاہئے۔

ناکامی کا سبب ذہن تقسیم ہونا ہے۔ کسی کو نام اور مقام چاہئے، کسی کا دل مال اور اولاد میں ہے اور کسی

کو انا پیاری ہے۔ خلوص کہاں رہا ــــ ؟ مقصد میں ذرّہ بھر ملاوٹ ذہن کو آلودہ کر دیتی ہے۔

واقفِ حال لوگ کہتے ہیں کہ خیال میں یکسوئی اور دل میں خلوص سے روحانیت کے باب کھلتے ہیں۔ جس فرد کا دل ڈانواں ڈول اور خیالات منتشر ہیں، وہ چاہے جتنے سال اس کوچے کی خاک چھان لے، بجز مایوسی کے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔

جس دل میں اللہ کی سچی طلب ہے، وہ دل پُر خلوص ہے۔ خلوص باطنی کشش ہے جو انسان کو ''سچائی'' تک پہنچاتی ہے۔ ایسے بندے پر تخلیقی رموز منکشف ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر ہے۔ زمین و آسمان، لوح و کرسی، دوزخ و بہشت غرضیکہ کوئی ایسی جہت یا مقام نہیں جہاں اللہ موجود نہ ہو۔ اللہ کا قرب ہر جگہ ممکن ہے بشرطیکہ دل میں خلوص ہو۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں،

اے کان بقا درچہ بقائی کہ نہ
درجائے نہ کدام جائے کہ نہ
اے ذات تو از ذات و جہت مستغنی
آخر تو کجائی و کجائی کہ نہ

ترجمہ: اے کانِ بقا! کون سی بقا ایسی ہے جس میں تو نہیں اور کون سی جگہ ایسی ہے جہاں تو نہیں۔ اے کہ تیری ذات، ذات و جہت سے مستغنی ہے۔ آخر تو کہاں ہے اور وہ کہاں ہے جہاں تو نہیں؟

صاف دل شخص کو معرفتِ الٰہی، مکان و زمان کی قید کے بغیر، ہر مقام پر اور ہر وقت حاصل ہو سکتی ہے۔ بندے کو چاہئے کہ قول و فعل میں خلوص کو مدنظر رکھے۔ اخلاقِ حمیدہ اور اوصافِ پسندیدہ سے دل پاکیزہ ہوتا ہے۔

خضر رہ مقصود اگر دل نہیں ہوتا
منزل کا پتہ سینکڑوں منزل نہیں ہوتا

درویش سے کسی نے التجا کی کہ مجھے معرفتِ الٰہی سے روشناس کر دیں۔

درویش نے برجستہ جواب دیا کہ میاں! دیدار کے لئے حوصلہ چاہئے ورنہ کوئی امر محال نہیں۔

حسرت اس دیر آشنا کی آرزو آساں نہیں
دل میں پہلے ضبطِ غم کا حوصلہ پیدا کرو

دنیا کا طلب گار دیدارِ حق کی تاب نہیں لا سکتا۔

؎ کوچۂ عشق ہے یہ رہ گزر عام نہیں

پُر خلوص دل میں ریا و نمائش نہیں ہوتی۔ متضاد صفات کی حامل چیزیں جیسے سیاہی سفیدی، تاریکی روشنی، رات دن، سردی گرمی، خوشی ناخوشی اور محبت نفرت ایک وقت اور ایک مقام میں موجود نہیں ہوتے۔ تاثیر الگ الگ ہونے سے ان کی اسپیس الگ ہے۔

ہم میں کتنے آدمی ایسے ہیں جو خالصتاً اللہ تعالیٰ

کے لئے عبادت کرتے ہیں ــــ؟

زید نے بکر سے پوچھا کہ تم خشوع و خضوع کے ساتھ عبادت کرتے ہو، یہ بتاؤ کہ تمہاری عبادت کی غرض وغایت کیا ہے؟

بکر نے کہا، بس آخرت سنور جائے۔

زید بولا، آخرت سے تمہاری کیا مراد ہے؟

بکر نے بتایا، جنت کا دائمی آرام میرا مقصود ہے۔

زید نے پوچھا، جنت کس نے بنائی؟

بکر نے جواب دیا، اللہ نے۔

زید نے پوچھا، اللہ کی بنائی ہوئی جنت کا دائمی آرام چاہئے لیکن تمہارے مقصدِ عبادت میں اللہ کا ذکر نہیں۔ کیا یہ خلوص ہے ــــ؟

بکر یہ سن کر نادم ہو گیا۔

ظاہر بیں بہشت کی لذتوں کے خواہش مند ہیں جب کہ اہلِ دل بجز دیدار جمال کبریائی، کسی کے خواستگار نہیں۔ حضرت امیر خسروؒ فرماتے ہیں،

عاشقاں را روز محشر باقیامت کار نیست
کار عاشق جز تماشائے جمال یار نیست

ترجمہ: حشر کے دن عاشقوں کو قیامت سے کوئی سروکار نہیں ہو گا کہ عاشق کا کام جمالِ یار کے سوا کچھ نہیں ہے۔

صدقہ خیرات کرتے ہوئے ارادی یا غیر ارادی طور پر ہماری نیت میں ملاوٹ ہو جاتی ہے۔ شعور تقاضا کرتا ہے کہ ہمارا نام ہو۔ آپ نے لنگر کا اہتمام کیا، لوگ کھانا کھائیں گے، چند افراد تعریف کریں گے اور آپ کا سینہ فخر سے پھول جائے گا۔ خواہش پوری ہو گئی مگر شخصیت میں خلا پیدا ہو گیا۔

یاد رکھیں کہ غیر ارادی عمل بھی طرز فکر کے تحت ظاہر ہوتا ہے۔ اگر مدد اللہ کی رضا کے جذبے سے ہو تو مخلوق ایسے بندے کی شیدائی ہو جاتی ہے۔ نیت میں کھوٹ سے ہم اپنا نقصان کرتے ہیں۔

حاصل کلام: ہمارے اعمال دکھاوے اور نمائش پر مبنی ہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ جو کام اللہ تعالیٰ کی خوش نودی کے لئے ہوتا ہے، وہی مقبولِ بارگاہ ہے اور زندگی کو زندگی بناتا ہے۔

لوگ کہتے ہیں ہماری دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ دعا کے لئے صدقِ مقال، اکلِ حلال اور خلوص لازمی ہیں۔ اس کے باوجود اللہ بے نیاز ہے۔ سب کو نوازتا ہے، وسائل عطا کرتا ہے مگر بندہ نعمتوں پر شکر ادا نہیں کرتا۔

خلوص کا متضاد ریاکاری ہے۔ ریاکار کے کام میں برکت نہیں ہوتی۔ دیکھا گیا ہے کہ سچے لوگوں کو اکثر صبر سے گزرنا پڑتا ہے لیکن حقیقی کامیابی اور اچھی شہرت کا سہرا ابھی انہی کے سر بندھتا ہے۔

مشاہدہ کریں تو ایسی مثالیں ملیں گی جو خلوص

کے اصول کو ذہن نشین کر دیتی ہیں۔ مثلاً کسی سے اظہار دوستی کریں اور ہزار رنگ آمیزیوں کے ساتھ خوش کن الفاظ کی بھرمار کر دیں مگر خلوص نہ ہو تو الفاظ میں اثر نہیں ہو گا۔ دل مثلِ آئینہ ہے۔ جیسے جذبات ہمارے دل میں کسی شخص سے متعلق ہیں، ویسا عکس مخاطب کے دل پر پڑتا ہے۔

مثل مشہور ہے،

؎ کند ہم جنس باہم جنس پرواز

ترجمہ: ہر کوئی اپنے ہم جنس کے ساتھ پرواز کرتا ہے۔

جب دل میں غبار پیدا ہوتا ہے گو زبان سے اظہار نہیں ہوتا اور نہ کبیدہ خاطر ہونے کی بظاہر وجہ ہوتی ہے تاہم دوسرا فریق جان لیتا ہے کہ کوئی ایسی بات ہے جس نے بدظن کر دیا۔

یاد رکھیں کہ محبت سے محبت اور نفرت سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ نفرت، نفرت سے دور نہیں ہوتی—— محبت سے دور ہوتی ہے۔ دوست بدظن یا بددل ہو گیا ہے تو فوراً اپنے دل سے منفی جذبات ختم کریں اور سچے دل سے اس کی جانب محبت کا خیال پیدا کریں۔ کچھ روز کے عمل سے دوست کا غبار، محبت میں تبدیل ہو جائے گا۔

دینی امور کے علاوہ دنیاوی معاملات میں بھی خلوص کے بغیر کامیابی نہیں ہوتی۔ کوئی قوم جب تک خلوص کے ساتھ کارِ خیر یا اصلاح میں مصروف رہتی ہے، غیب سے مشکلات دور ہوتی ہیں۔ بالآخر وہ سخت حالات سے گزر کر سنہرے دور میں قدم رکھتی ہے۔ اس کے برعکس اگر خلوص میں ملاوٹ ہو تو ثابت قدم رہنا محال ہے۔

دنیا کے کسی مخلص فرد کی سوانح عمری پڑھیں، حالات زندگی بتائیں گے کہ جس قوم میں ایسا فرد پیدا ہوتا ہے، چند روشن ضمیر افراد کے سوا، قوم کے باشندے شروع میں اس کی بے حد مخالفت اور حوصلہ شکنی کرتے ہیں، خدمات کی قدر نہیں کرتے اور طرح طرح سے رخنہ اندازی کرتے ہیں مگر یہ پُرعزم اور نیک بندہ ارادے سے پیچھے نہیں ہٹتا۔ صبر سے مصائب کا مقابلہ کرتا ہے اور کامیاب ہو جاتا ہے۔ کیسے——؟ یہ سب خلوص اور بے لوث خدمت کا اثر ہے۔ یہ مثال ہر اس شخص پر صادق آتی ہے جس نے ہجوم کو قوم بنایا اور روحانی قوت سے دلوں کو تسخیر کر کے اصلاح کی۔

علمِ معرفت کا اصول ہے کہ ظاہر سے جب تک بے تعلقی نہ ہو، باطن کی جانب توجہ نہیں ہوتی۔

بندہ مظاہرِ عالم پر نظر ڈالتا ہے اور حوادثِ دنیا کو عبرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو اسے دنیا کی بے ثباتی کا ثبوت قدم قدم پر ملتا ہے۔ بالآخر ہاتف غیب اسے ندا دیتا ہے،

دیکھ او غافل ذرا دنیا کو پہچانے ہوئے
کل جو قصے پیش پا تھے آج افسانے ہوئے

جب تک حق و غیر حق کی تمیز نہ ہو اور عارضی و دائمی اشیا میں فرق سمجھ میں نہ آئے، زندگی زندگی نہیں رہتی۔ ریاکاری اور حرص و ہوس پیدا ہو تو ایسے میں دنیا کی بے ثباتی کا خیال پیش نظر رہے۔ یہ نیت کو خالص کرنے کا آسان طریقہ ہے۔

روح اور جسم مختلف عالم ہیں۔ روحانی عالم کی ہر شے ازلی و ابدی ہے، جسمانی اشیا کو فنا ہے۔ انسان گوشت پوست کا نام نہیں، دائمی جوہر کا مظہر ہے۔ خلوص کے لئے یک جہتی اور یگانگت چاہئے جو روحانی اتحاد کی بنا پر ممکن ہے۔ یہی تعلق گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔ دل میں کسی کی طرف سے کشیدگی ہو تو یاد رہے کہ بظاہر رنگ و روپ اور صورت میں ہم مختلف ہیں لیکن اصل دونوں کی ایک ہے۔

عالمِ روحانیت میں سب یکساں ہیں۔ نہ کوئی غیر ہے نہ کوئی بیگانہ۔ جیسے تالاب میں کنکر پھینکنے سے سطح پر لہریں پیدا ہوتی ہیں اور خفیف حرکت کا اثر دور تک سب پر پڑتا ہے۔

خلوص کو پیش نظر رکھنے کا دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ ہم سب اللہ کی مخلوق ہیں۔ جس کے لئے ہم ناگواری محسوس کرتے ہیں اور جس کو ہم ناگوار گزرتے ہیں، سب کو اللہ نے پیدا کیا ہے۔ ہم نے مفلس اور دردمند کی دل جوئی کی ہے تو تعریف اور قدردانی کا مطلق خیال دل میں نہ لائیں۔ نیکی، نیکی کے واسطے ہوتی ہے نہ کہ معاوضے کی غرض سے۔

خلوص کا درجہ اس قدر عظیم ہے کہ مرشد کامل کی نظر ہمیشہ اہلِ خلوص پر پڑتی ہے۔ طالب علم مرشد کی جانب ایک قدم بڑھاتا ہے تو مرشد دس قدم بڑھ کر خیر مقدم کرتا ہے۔ مبارک ہیں وہ جن کے دل میں خلوص ہے اور طلب صادق ہے۔

مضمون پڑھنے کے بعد سورہ اخلاص پڑھئے۔ اس سورہ میں پانچ اصول بیان ہوئے ہیں۔ ان پر الگ الگ غور کیجئے۔

### تکلیف پہنچانے والا خوش نہیں رہتا

یہ کیسا الم ناک اور خوف ناک عمل ہے کہ ہم دوسروں کو نقصان پہنچا کر خوش ہوتے ہیں۔ درخت ایک ہے، پتّے اور شاخیں متعدد ہیں۔ اگر کوئی شاخ اپنے درخت کی جڑ پر ضرب لگائے تو وہ خود کس طرح محفوظ رہ سکتی ہے ــــ؟ خوشی اگر ہمارے لئے معراجِ تمنا ہے تو ہم اپنے ہم جنسوں کو تکلیف پہنچا کر کیسے خوش رہ سکتے ہیں ــــ؟ (کتاب: کشکول)

عظیمی




چاند کی کرنوں سے ـــ

گھنے اور لمبے بالوں کی نشوونما

45 سال سے خواتین کا پسندیدہ

# روغن گلو سبز

کراچی: 021-36039157
حیدرآباد: 0222781798
میرپورخاص: 03133508543
ڈگری: 03453700144
ملتان: 03006338192

فیصل آباد: 041-8540132
لاہور: 03224112737
راولپنڈی: 051-5169242
اٹک: 03135168800
ہری پور: 03135914147

پشاور: 03219110156
مانسہرہ: 03005621447
مظفرآباد: 05822446661
میرپور: 03455701558

بلال حسن

# مینڈکوں کی بستی

کھڑے کھڑے آس پاس کا جائزہ لیتے ہوئے نظر خزاں رسیدہ ٹہنیوں کی طرف گئی اور چند لمحوں بعد میں ٹھٹک گیا۔ نظر پر دھوکے کا گمان ہوا۔ تھوڑا قریب جاکر دیکھا تو ٹہنیوں کے ہم رنگ ڈیڑھ فٹ کا سانپ درمیانی ٹہنی سے لٹک رہا تھا۔

میرا گھر شہر کے ہنگام سے دور مضافات میں ہے جہاں زمین پر سبزہ اور اطراف میں درختوں سے ہریالی ہے۔ ہوا صاف ہے اور ماحول میں گاڑیوں اور لوگوں کا شور نہیں۔ آواز ہے تو جانوروں، پرندوں اور حشرات الارض کی۔ ان میں کویل ہے، چڑیاں ہیں، کبوتر ہیں، ہدہد ہے، کوّے بھی ہیں اور مختلف نسل کے خوش رنگ پرندے اتنے ہیں کہ میں ان کے شجرے سے واقف نہیں۔

مکانات کم ہونے کے باوجود لگتا ہے کہ زمین پر کوئی جگہ خالی نہیں۔ جہاں آدمی نہیں رہتے، وہاں دوسری نوعیں بسیرا کرتی ہیں اور جب آدمی آتا ہے تو پتہ نہیں کیا رمز ہے کہ نوعیں ایک ایک کرکے رخصت ہوجاتی ہیں۔

جب ہم نے مضافات میں رہائش اختیار کی تو چند روز میں معلوم ہوا کہ ہریالی اور خوش رنگ و خوش آواز پرندوں کے علاوہ یہاں سانپ، نیولے اور گوہ بھی ہیں۔ والد صاحب نے کہا کہ جس جگہ پر آدمی نہ ہوں، اس جگہ کو غیر آباد نہ کہا جائے کیوں کہ وہاں دیگر مخلوقات رہتی ہیں۔ غیر آباد کہنا ظاہر کرتا ہے کہ ہم اپنے علاوہ کسی کو مخلوق نہیں سمجھتے۔

پرندوں کے لئے کھانا پانی رکھا۔ گھر کے اندر باہر کو پودوں سے سجادیا۔ صبح جلدی اٹھ کر چہل قدمی کرنے سے صحت اچھی ہوگئی۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ خوش رنگ پرندے دیکھے جو دن میں نہ جانے کہاں چلے جاتے ہیں اور شہر میں نظر نہیں آتے۔ مضافاتی ماحول میں رہ کر لگتا ہے کہ صبح کی زندگی الگ، دوپہر کی الگ اور شام کی تقریباً صبح جیسی ہے۔ صبح کے پرندے اور ہوا دوپہر میں نہیں ملتے، شام میں دونوں لوٹ آتے ہیں۔

آس پاس ہر تیسرے چوتھے دن کوئی سانپ نظر آجاتا اس لئے اندازہ ہوا کہ یہاں نیولے بھی

رہتے ہیں۔ نیولے اور سانپ کی نسلوں سے دشمنی ہے اور میں نے ہمیشہ نیولے کو غالب ہوتے دیکھا ہے کہ وہ سانپ کی گردن الگ کر دیتا ہے۔

حیوانات کی دنیا کا جائزہ لیں تو دلچسپ مظہر نظر آتا ہے کہ قدرت نے شکار اور شکاریوں کو ہر جگہ ساتھ رکھا ہے۔ غالب امکان ہے کہ ایسا آبادی کی مقدار میں توازن کے لئے ہو۔

ﷺ

ایک صبح جھاڑیوں میں سے دو سر باہر نکلے، ادھر ادھر دیکھا پھر تیزی سے برتنوں کی طرف آئے۔ یہ نیولے تھے جو بہت پھرتیلی اور ہر وقت حرکت میں رہنے والی مخلوق ہے۔ ان کے پیچھے دو چھوٹے نیولے تھے۔ چاروں نے پیٹ بھر کر پانی پیا اور واپس جھاڑیوں میں چلے گئے۔

گوہ کا سراغ اس طرح ملا کہ ایک روز بھوک سے نڈھال کتّا دروازے کے سامنے بیٹھ گیا اور نظریں دروازے پر مرکوز کر دیں۔ اس دوران خیال آیا کہ باہر کوئی بھوکا ہے، کھانا پانی دیکھ لینا چاہئے۔ دروازہ کھولا اور خیال کی تصدیق ہو گئی۔ کتّا دروازے پر نگاہیں مرکوز کئے بیٹھا تھا۔ دودھ رکھا تو وہ دم ہلاتا ہوا آیا اور غٹ غٹ دودھ پی گیا۔ اس روز سے اس نے گھر کی چوکیداری سنبھال لی جو مرتے دم تک نبھائی۔

کبھی کھانا رکھنا بھول جاتے تو اطلاع ملتی تھی کہ باہر کوئی منتظر ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اگر ایک فرد سستی کا مظاہرہ کر کے خیال کو نظر انداز کر دیتا تو یہی خیال دوسرے فرد کو آتا تھا۔ ہم میں سے کوئی آواز لگاتا کہ دیکھو پانی تو ختم نہیں ہو گیا۔ باہر جاتے تو بجلی کی تار پر قطار سے کبوتر خاموش بیٹھے ہوتے تھے اور نیچے برتن خالی۔

پرندے اور جانور پیغام دیتے ہیں۔ جب ان کو بھوک لگتی ہے تو لہریں ماحول میں پھیل جاتی ہیں اس لئے ہمیں ان کی ذمہ داری سے کوتاہی نہیں برتنی چاہئے۔ یقیناً یہ قدرت کی طرف سے پیغام تھا جو سب گھر والوں کو ملتا تھا کہ اپنے آس پاس مخلوقات کا خیال رکھیں۔

ایک روز کھانے کے وقت کتّا نظر نہیں آیا، ہم دودھ رکھ کر اندر آ گئے۔ کچھ دیر بعد کھڑکی سے دیکھا تو بڑی چوڑی چھپکلی نما مخلوق برتن میں سر ڈالے دودھ پی رہی تھی۔ یہ گوہ تھا جو چھپکلی سے مشابہ صحرائی جانور ہے اور زمین میں بھٹ بنا کر رہتا ہے۔ اسے سوسمار بھی کہتے ہیں۔

گوہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم چندن گوہ جو پتلی ہوتی ہے اور دوسری پٹڑا گوہ جو چوڑی ہے۔ اس طرح گوہ بھی دیکھ لی۔

ﷺ

خزاں کا موسم تھا۔ پتّے جھڑ چکے تھے اور بعض درختوں پر ٹہنیاں رہ گئی تھیں۔ ہم کرکٹ کھیل

ماحول سے ہم رنگ اور بھیس بدلنے والے جان دار

رہے تھے۔ گیند درخت نما پودے کے قریب گئی، میں گیند اٹھا کر واپس آیا۔ تھوڑی دیر بعد گیند دوبارہ اس طرف گئی۔ میں نے جا کر اٹھائی، بھائی کی طرف پھینکی اور پودے کے قریب کھڑا ہو گیا کہ گیند دوبارہ اس طرف آئی تو پکڑ لوں گا۔ کھڑے کھڑے آس پاس کا جائزہ لیتے ہوئے نظر خزاں رسیدہ ٹہنیوں کی طرف گئی اور چند لمحوں بعد میں ٹھٹک گیا۔ نظر پر دھوکے کا گمان ہوا۔ تھوڑا قریب جا کر دیکھا تو ٹہنیوں کے ہم رنگ ڈیڑھ فٹ کا سانپ درمیانی ٹہنی سے لٹک رہا تھا۔

بہن بھائی مجھے ششدر دیکھ کر قریب آئے ۔ کسی کو سانپ نظر نہیں آیا۔ میں نے درمیانی ٹہنی کی طرف اشارہ کیا تو سب کو سانپ سونگھ گیا۔ سانپ بے حرکت تھا، سمجھ میں نہیں آیا مر گیا ہے یا حملے کے لئے تیار ہے۔ لمبی لکڑی لی اور دور سے ہلایا تو سانپ نے حرکت کی۔ ٹہنی سے اتر کر تیزی سے خالی پلاٹوں کی طرف رینگتا ہوا نکل گیا۔ کسی نے پیچھا نہیں کیا کیوں کہ زمین اور اس کے رنگ میں فرق نہیں تھا۔

ہم خوف زدہ ہو گئے کہ پتہ نہیں سانپ کب سے لٹک رہا تھا۔ اللہ نے حفاظت کی۔ پریشانی اس بات کی تھی کہ سانپ کو دیکھ کر ٹہنی کا گمان ہوا۔ لچک دار سانپ لکڑی کی طرح بے لچک تھا۔ رنگ ٹہنی کے ہم رنگ اور طوالت یکساں تھی۔ آئندہ کیسے پتہ چلے گا کہ یہ ٹہنی ہے یا سانپ——؟

بیرونی دیوار بیل سے ڈھکی ہوئی ہے جس پر زرد پھول کھلے ہوئے ہیں۔ ایک روز کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھ رہا تھا کہ گرگٹ نظر آیا، رنگ بھورا تھا۔ گرگٹ کی حِس نے خبردار کیا کہ قریب کوئی ہے۔ 360 ڈگری کے زاویے سے حرکت کرنے والی آنکھوں کے ڈیلے گھومے اور ہماری کھڑکی کی طرف آ کر رک گئے۔ چند لمحوں میں اس کا رنگ بیل کے ہم رنگ یعنی سبز ہو گیا۔ معلوم تھا کہ وہ کہاں ہے اس لئے میں رنگ بدلنے کے بعد بآسانی دیکھ سکتا تھا۔ پلک جھپکی تو تلاش کرنا مشکل ہو گیا۔

بہن کو آواز دی، اس نے بھی یہ منظر دیکھا۔

گرگٹ کے بھیس بدلنے کی صلاحیت کے بارے میں پڑھ چکا ہوں— پڑھنے اور مشاہدے میں فرق ہوتا ہے۔ رنگ بدلتا دیکھ کر تجسس ہوا کہ گرگٹ کا اصل رنگ کون سا ہے اور کوئی ہے جس نے اس کو اصل رنگ میں دیکھا ہو؟

گرگٹ کی کچھ اقسام بھورے سے سبز اور سبز سے سیاہ رنگ میں تبدیل ہونے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور کچھ اقسام ایسی ہیں جو ہر رنگ غالب کر سکتی ہیں۔ گرگٹ ایک رنگ 20 سیکنڈ سے بھی کم وقت میں تبدیل کرتا ہے۔ اگرچہ کچھ جانور رنگ بدلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں مگر کہتے ہیں کہ گرگٹ جیسی پھرتی سے یہ کام کوئی نہیں کرتا۔

گرگٹ جلد کی پرتوں میں موجود کرومیٹو فورز کی مدد سے رنگ بدلتا ہے۔ کرومیٹو فورز پگمنٹ* کے حامل روشنی منعکس کرنے والے خلیات ہیں جو روشنی، حرارت اور مزاج کے مطابق ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ جب گرگٹ کے جسم میں موجود رنگین خلیات کا حجم (سائز) پھیلتا یا سکڑتا ہے تو ماحول میں جس رنگ کو منعکس کرنا مطلوب ہو، وہ رنگ گرگٹ کی جلد پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس صلاحیت کو استعمال کر کے گرگٹ جس شے پر بیٹھتا ہے سبک رفتاری سے اس کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔

سمجھا جاتا ہے کہ گرگٹ اور دوسرے جانور صرف خطرے کے وقت رنگ بدلتے ہیں۔ محقق کہتے ہیں کہ روشنی، درجۂ حرارت، پیغام رسانی اور مزاج بھی رنگ بدلنے کی وجوہات ہیں۔ رنگ بدلنے کی صلاحیت یعنی بھیس بدلنے کو کیموفلاج camouflage کہتے ہیں۔

لکڑی سے ہم رنگ سانپ لکڑی سے لپٹ جائے تو سانپ نظر نہیں آتا، سب اسے لکڑی سمجھتے ہیں۔ پانی میں ٹرانسپیرنٹ جیلی فش حرکت نہ کرے تو دونوں میں تفریق نہیں ہوتی۔ پھر پہچان جسمانی ساخت سے ہے، رنگوں سے ہے یا ساخت کی بناوٹ رنگوں سے ہے؟

رنگ ماحول کو بامعنی بنانے اور مخلوق کی بقا کے لئے ناگزیر ہیں۔ رنگوں کی زبان روشنی کے مطابق کام کرتی ہے کیوں کہ رنگ روشنی کا عکس ہیں۔ جب ذہن میں نورانیت ہوتی ہے تو چہرے کا رنگ صاف ہو جاتا ہے۔ ذہن میں وسوسے ہیں تو رنگ میں چمک ماند پڑ جاتی ہے۔

رنگ کی زبان نہ آئے تو مخلوق کوئی فعل انجام نہیں دے سکتی۔ اعضا کا بننا، ایک دوسرے کی پہچان، خوراک کی تلاش، زندگی کے لئے حرارت جذب اور خارج کرنے کا عمل، جذبات کا اظہار،

---

* پگمنٹ (جانوروں اور پودوں کے خلیات میں وہ مادے جن سے رنگ بنتے ہیں۔)

دشمن سے محفوظ رہنا اور انہیں خوف زدہ کرنے کا ذریعہ رنگ ہیں۔ رنگ ختم ہو جائیں تو نقوش مٹ جاتے ہیں کیوں نقوش رنگ سے بنے ہیں۔

باطنی علوم کے ماہرین فرماتے ہیں کہ رنگ مقداریں ہیں۔ ہر شے مقداروں سے تخلیق ہوئی ہے۔ مقداریں ایک دوسرے سے الگ اور قریب بھی ہیں کیوں کہ مقداروں میں ایک دوسرے کا رنگ قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔ یہاں کوئی چیز ایک نہیں، اس میں دوسری چیزوں کے اجزا شامل ہیں۔ سفید، سرخ، سبز، زرد، نارنجی، سیاہ، گلابی، نیلا، سلیٹی اور خاکی ـــــ سارے رنگ مرکب ہیں۔

ہر شے کا رنگ ہے اور یہ سارے رنگ پانی سے نکلے ہیں۔ احسن الخالقین اللہ کا ارشاد ہے:

”کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور پھر اس کے ذریعے سے ہم طرح طرح کے پھل نکالتے ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں، اور پہاڑوں میں بھی سفید، سرخ اور گہری سیاہ دھاریاں پائی جاتی ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہیں۔“

(فاطر: ۲۷۔۲۸)

اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کے رنگ اور ماحول میں مطابقت رکھی ہے۔ سرد علاقوں میں رہنے والی نوعوں کا رنگ گرم علاقوں میں رہنے والی نوعوں سے مختلف ہے۔ صحرائی جانوروں، پرندوں اور حشرات کا رنگ اپنی ہی نوع کے میدانی اور پہاڑی علاقوں میں رہنے والے جانوروں سے مختلف ہے۔ رنگوں کی تبدیلی کی بنیادی وجہ مختلف خطوں میں خوراک، ہوا اور پانی کی تبدیلی ہے۔

بعض حیوانات کا رنگ ماحول کے مطابق ہوتا ہے اور بعض کو قدرت نے کیموفلاج کی صلاحیت دی ہے کہ حالات کے تحت رنگ غالب کریں۔ مختلف ساخت کے باوجود کیموفلاج کے ذریعے ایک نوع، دوسری نوع کی طرح نظر آسکتی ہے۔

چند مثالیں درج ذیل ہیں:

۱۔ ملائشیا میں پتّے کی شکل کا چھوٹا مینڈک جنگل کے رنگوں میں نظر نہیں آتا۔ اس کا معروف نام ”ملاین لیف فراگ“ ہے۔ اگر جنگل سے گزر ہو تو زمین پر بکھرے ہوئے پتّوں کو غور سے دیکھیں۔ خارج از امکان نہیں کہ جسے آپ پتّے سمجھ رہے ہیں، وہ مینڈکوں کی بستی ہو۔

۲۔ کیموفلاج کا عمل صرف جلد کی بیرونی پرتوں میں نہیں ہوتا۔ جنوبی امریکا کے ٹروپیکل جنگلات میں مینڈکوں کے پٹھے رنگ دار ہوتے ہیں۔ یہ ٹہنیوں اور گیلے پتّوں پر گہرا رنگ اختیار کرتے ہیں اور خون کے ذریعے کیموفلاج کرتے ہیں۔

۳۔ کیکڑا نما مکڑا یعنی Crab spider کی ایک قسم Misumena varia (میزومینا ویریا) جس

پھول پر بیٹھتی ہے، زرد سے لے کر سفید تک مختلف رنگ اختیار کر سکتی ہے۔

۴۔ ٹڈوں کی ایک نسل ایسی ہے جن کے نقوش ایک قسم کی کائی parasitic fungus سے بہت مماثلت رکھتے ہیں۔ ٹڈوں کی لمبی ٹانگیں ان کی موجودگی ظاہر کر سکتی ہیں اس لئے قدرت نے اس نسل کے ٹڈوں کی ٹانگیں ٹرانسپیرنٹ رکھی ہیں۔

۵۔ جنوب مشرقی ایشیا کا Whip snake درختوں میں رہتا ہے۔ بیرونی جلد سبز چھلکوں سے ڈھکی ہوتی ہے۔ چھلکے درخت پر موجود کائی سے مشابہ ہونے کے باعث کیموفلاج کا کام دیتے ہیں۔

۶۔ افریقا کے وسطی اور مغربی بارانی جنگلات میں پایا جانے والا Rhinoceros viper زہریلا سانپ ہے۔ جلد نیلے، زرد، سیاہ، سبز اور سرخ جیومیٹریکل نقوش سے ڈھکی ہوتی ہے۔ نقوش مثلث، مستطیل اور ہیرے کی شکل کے ہیں اور اس کے رنگ ماحول سے ملتے ہیں۔ گیلی جگہ پر رہتا ہے۔ اس کو پہچاننا اجنبی کے بس کی بات نہیں۔

قدرت نے گرگٹ اور اس جیسی رنگ بدلنے والی مخلوقات کو رنگوں کی سائنس کا علم دیا ہے۔ ان مخلوقات کے اندر رنگوں کی پرتیں یا ایسے خلیات ہیں جو آئینہ بن جاتے ہیں۔

بہن کو گرگٹ دکھاتے وقت میں نے کہا کہ دیکھو! گرگٹ کے اندر سارے رنگ موجود ہیں۔ کتنے رنگوں کو کتنی مقدار میں ملا کر کون سا رنگ بنانا ہے ـــــ گرگٹ کو معلوم ہے۔ یہ حیرت انگیز صلاحیت، ایک مکمل شعبہ اور سائنس ہے جس کا علم قدرت نے چھوٹی بڑی مخلوقات کو دیا ہے۔

بہن کے جواب پر مجھے حیرت ہوئی۔

اس نے کہا، بھائی! جب حیوانات کو دیئے گئے علم کا یہ کمال ہے پھر ”احسنِ تقویم انسان“ کے علم کا درجہ کیا ہو گا ـــــ؟

# انڈا.....مرغی
# مرغی.....؟انڈا

کائنات کے نظام پر تحقیق کر کے تم خود کو عالم فاضل سمجھتے ہو، ایجادات کرتے ہو، علوم کے شعبے بناتے ہو اور جس نے یہ نظام بنایا ہے، اس کے وجود کو highlight کرنے سے انکار کر دیتے ہو۔ اگر مذہب کا علم نہ ہو تو تم سائنس کے علم سے واقف نہیں ہو سکتے۔

---

چوتھی مجلس: وقاص نے کہا، باجی! نیچر قانون ہے جو کائنات میں جاری و ساری ہے۔ کسی دانش ور کا کہنا ہے کہ تمام مظاہر اٹل قوانین کے ماتحت ہیں جن کی راہ میں کوئی طبیعی یا غیر طبیعی قوت حائل نہیں ہو سکتی۔

میں نے جواب دیا، بے شک دانش ور صاحب کو ذہانت عطا کی گئی ہے مگر ابھی ان کا ذہن کھلا نہیں۔ اٹل قوانین کے اندر کوئی حقیقی قوت موجود ہے جو آدمی کو نیکی اور تقویٰ کی طرف لے جاتی ہے۔ جس دانش ور کا تم حوالہ دے رہے ہو اس نے اپنی منطقی کتاب میں لکھا ہے کہ اٹل قوانین میں حاکمانہ قوت مخفی ہے۔ پس بتاؤ نیچر سے تمہارا مقصود کیا ہے؟ نیچر اور نیچر کے قوانین میں کیا فرق ہے؟

اس سے پہلے کہ وقاص کچھ کہتا، میں نے بات جاری رکھی ـــــ میں نے ایسے محققین کی کتابیں پڑھی ہیں جن کو دنیا بڑا مانتی ہے۔ وہ خواصِ اعضا، بجلی، کیمیا، نباتات اور حیوانات وغیرہ کے بارے میں سلیقے سے گفتگو کرتے ہیں لیکن جب باطن کا ذکر آتا ہے تو حواس گم ہو جاتے ہیں اور گفتگو معمولی سطح کے آدمیوں کی طرح ہو جاتی ہے۔ ذہانت اس پر صرف ہوتی ہے کہ وہ خالق، معجزہ اور خلق کے الفاظ پر بحث شروع کر دیتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ یہ ہنر دکھاتے ہیں کہ ان کو دوسرے الفاظ جیسے نیچر، فطرت اور قانون سے بدل دیتے ہیں۔ جب تمہیں یقین ہے کہ قانون اصل محرک ہے پھر دلیل پیش کیوں نہیں کرتے؟

وقاص بولا، دانش وروں کا اتفاق ہے کہ ہر چیز قانون کے ذریعے واقع ہوتی ہے۔

میں نے تائید کی کہ ایسا ہے مگر قانون کام کی انجام دہی کا ذریعہ یا طریقِ کار ہے، محرک نہیں۔ تجارت گاڑیوں کے ذریعے ہوتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ گاڑیاں اپنے ارادے سے نہیں چلتیں۔ گاڑی

بااختیار قوت نہیں ہے۔ سلطنت قانون سے چلتی ہے مگر خود قانون حکم ران نہیں ہے بلکہ جج قانون کے مطابق عمل کرواتے ہیں۔ بس زیادہ سے زیادہ آپ نے یہ کیا کہ خالق کے لفظ کی جگہ دو لفظ نیچر اور قانون رکھ دیئے۔

وقاص کے پاس دلیل نہیں تھی۔

میں نے کہا، تم تسلیم کرتے ہو کہ وجود میں کوئی قوت یا فعال ہستی موجود ہے اور یہ کہ حیات ہائیڈروجنی انڈے سے شروع ہوئی۔ لیکن اس بارے میں کچھ نہیں جانتے کہ آخر یہ انڈا بنا کیسے؟ کیوں کر محفوظ رہا؟ کس طرح ایسے عجیب روپ بھر سکا جو عقل و ذہانت کے لئے سوال ہیں۔ سچ یہ ہے کہ تم واجب الوجود خالق کی جگہ ایک غیر موجود کو تسلیم کرتے ہو۔ حالاں کہ ساتھ ہی ایک فعال قوت کے وجود کو بھی مانتے ہو اور کہتے ہو کہ ذرّات ازلی، ابدی طاقت سے رونما ہوئے ہیں۔ اب برائے عنایت بتا دو کہ ہائیڈروجنی انڈے کا جوڑا کیوں ملا؟ کب ملا؟ کون اس کے بچے پیٹ کے نیچے رکھ کر سینے بیٹھا؟ کس نے بچہ پیدا کروایا؟ تمہیں خالق کا لفظ پسند نہیں—— قانون اور نیچر کے لفظوں پر فریفتہ ہو گئے۔

میرے بھائی! قلب میں کوئی حکم ران موجود ہے۔ نیچر کو ہر شے کا محرک ماننے والے کہتے ہیں کہ نیچر نامعلوم قوت کا مظاہرہ ہے، آدمی جس کے بھید سے واقف نہیں۔ پھر وہ کیوں تسلیم نہیں کرتے کہ قانونِ قدرت کے پیچھے ایک قوت موجود ہے؟ ان اقوال کی روشنی میں دیکھ سکتے ہو کہ لامذہبوں اور اہل مذاہب میں فقط لفظی جھگڑا ہے۔ اہل مذاہب جس ہستی کو خالق کے نام سے پکارتے ہیں، لامذہب اسی کو نیچر یا مافوق الفطرت بتاتے ہیں۔ سارا جھگڑا لفظ کا ہے۔ تم خود بھی تسلیم کرتے ہو کہ مافوق الفطرت قوت معدوم ہو جائے تو کوئی کائناتی عمل رونما نہیں ہو سکتا۔ اس کو تسلیم کر کے تم میرے یقین میں شریک ہو جاتے ہو کہ ایک فعال قوت موجود ہے جو بااختیار ہے اور اس نظام کو چلا رہی ہے۔ بتاؤ! جس قوت میں عقل اور ادراک نہ ہو، کیا وہ دوسروں کو ان صفات سے نواز سکتی ہے؟ میرے بھائی! تمہارے اندر ذہانت و عقل کہاں سے آئی؟ اس کا سرچشمہ کیا ہے؟

بھائی صاحب نے کہا، یہ مجھے اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں ملی ہے۔

میں نے برجستہ کہا، درست! بالکل درست! اور تمہارے نظریے کے مطابق تمہارے ایک جدِ امجد حضرت بندر بھی ہیں۔

اس جملے پر وہ خفا ہو گیا۔

میں نے معذرت کر کے بات آگے بڑھائی۔

دیکھو بھائی! نیچر کو کائنات کا محرک تسلیم کرنے والے کہتے ہیں کہ نیچر کے پس پردہ نامعلوم قوت ہے لیکن ساتھ ساتھ بہت سی بے تکی باتیں کہتے ہیں۔ وہ ذرّات و جزیات کا ذکر کرتے ہیں، حجم و وزن بتاتے ہیں اور انہیں جمع کرنے والی قوت کو بیان کرتے ہیں۔ مگر پوچھا جائے کہ یہ ذرّات و جزیات کیا چیز ہیں؟ تو کوئی جواب نہیں دیتے۔ مثلاً کہتے ہیں کہ جتنے عناصر ہیں وہ ہائیڈروجن کی مختلف شکلیں ہیں۔ بہتر! لیکن خود ہائیڈروجن کیا ہے؟ کہاں سے آیا؟ کیوں کر آیا؟ جواب ندارد۔ معذرت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ ان باتوں کو ماننے والے محقق ابھی تک قانون قدرت سے واقف نہیں۔ یہ لوگ کشش کے قانون کو شد و مد سے بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس قانون کی وجہ سے سیب زمین پر گرتا ہے، سورج زمین کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے مگر کشش، جذب اور جاذبیت کیا ہے، کوئی جواب نہیں ملتا۔ آخر مجبور ہو کر ایک دانش ور اعتراف کرتا ہے کہ ہمیں یقین ہے ہم اشیا کی ماہیت و حقیقت نہیں جانتے۔

چوتھی مجلس یہاں ختم ہو گئی۔

پانچویں مجلس: میں چاہتی تھی کہ گفتگو کسی نتیجے پر ختم ہو۔ میں نے کہا، وقاص! تمہارے دلائل سے اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ نیچر اندھی بڑھیا ہے جس کے پیٹ میں مردہ اندھی اشیا کے ذرّات بھرے پڑے تھے جو تاریکی میں اتفاق سے بڑھے اور پلے۔ تم قائل ہو کہ جزئیات یا ذرّات اولین مادہ ہیں، کائنات ان سے بنی۔ نیز تم یہ بھی مانتے ہو کہ ذرّات حرکت اور نشوونما کے لئے کسی قوت کے محتاج ہیں۔ جب اس قوت کی حقیقت دریافت کرتی ہوں تو تم سے کوئی جواب نہیں بنتا۔ نیچر کا قانون ہے کہ سیب اڑ کر آسمان پر نہیں جاتا، درخت سے زمین پر گرتا ہے، کل ہماری اماں اس قانون کی راہ میں رکاوٹ بن گئیں۔ انہوں نے سیب زمین پر گرنے نہیں دیا، ہاتھ سے روک لیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قوت ہے جو نیچر کو چلاتی ہے۔ نیچر نظام ہے اور اس نظام کو وہ ہستی چلاتی ہے جس نے یہ نظام تخلیق کیا ہے۔

وقاص بولا، باجی! آپ ہر بات مذہب کے آئینے میں دیکھتی ہیں اس لئے مذہب کو درمیان میں لے آتی ہیں۔ بھلا سائنس کا مذہب سے کیا لینا دینا؟

میں نے وضاحت کی، یہی تمہاری اور ان لوگوں کی بھول ہے جن کے نظریات پر یقین کر کے تم حقیقت سے دور ہو گئے۔ مذہب کہتا ہے کہ خالق ایک ہے جس نے یہ کائنات بنائی ہے۔ کائنات کیا ہے ــــ؟ ایسی سائنس ہے جس کے نظام میں تبدیلی اور تعطل نہیں۔ کائناتی نظام پر تحقیق کر کے تم خود کو عالم فاضل سمجھتے ہو، ایجادات کرتے ہو،

علوم کے شعبے بناتے ہو اور جس نے یہ نظام بنایا ہے، اس کے وجود کو highlight کرنے سے انکار کر دیتے ہو۔ اگر مذہب کا علم نہ ہو تو بھائی ! تم سائنس کے علم سے واقف نہیں ہو سکتے۔ سائنس فرضی نظریات قائم کرتی ہے، مذہب کہتا ہے کہ تخلیق کے قوانین شواہد کی صورت میں تمہارے سامنے موجود ہیں—زمین و آسمان اور خلا میں موجود نشانیوں پر غور کرو۔

وقاص نے پوچھا، بتایئے کہ حیات کا مادہ کیا ہے؟

میں نے کہا، ہماری زمین کے علاوہ کائنات میں لاشمار عالمین ہیں۔ سب میں حیات کا مادہ مختلف ہے لیکن حیات ایک ہے اور اسے عطا کرنے والی قوت بھی ایک ہے۔ ہماری زمین پر حیات کا مادہ کیچڑ ہے۔ کھنکھناتی، سڑی ہوئی بجنی مٹی سے تخلیق ہوا ہے آدمی۔ سڑی ہوئی مٹی کو کیچڑ کہنے میں کیا عار! کیچڑ ننھے ننھے ذرّات سے مرکب ہے۔ جو شعور ہمارے تمہارے اندر ہے، اسے ذرّات میں بھی تسلیم کرو۔ ذرّے کو ملنے والا شعور انڈے میں بھی موجود ہے جس کو تم ہائیڈرو جنی انڈا کہہ رہے ہو۔

دیکھو بھائی! جسے تم نامعلوم قوت کا نام دیتے ہو، وہ خالقِ کائنات ہے۔ ہر زبان میں نام الگ ہیں لیکن معنی سب کے ایک ہیں—خالق کُل۔ سب مانتے ہیں کہ خالق ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اسی نے نیچر کو تخلیق کیا ہے اور وہی اسے چلاتا ہے۔ اس ہستی نے انڈا بنایا ہے، اس میں توانائی اور مقداریں رکھی ہیں لیکن حرکت کا اختیار خالق کائنات کے پاس ہے۔ معین وقت کے بعد انڈے سے ہاتھ پیر نکلتے ہیں اور قسم قسم کی مخلوقات ظاہر ہوتی ہیں۔ ہر انڈے سے بچہ نہیں نکلتا نہ مرغی پیدا ہوتی ہے۔ انسان اپنے افعال و اعمال میں کچھ اختیار رکھتا ہے مگر یہ اختیار بھی بے اختیار ہے اس لئے کہ اختیار کسی کا عطا کردہ ہے۔

وقاص نے کہا، میں غذا کا انتخاب مرضی سے کرتا ہوں۔ میرے پاس اختیار ہے۔

میں نے کہا، بات کسی حد تک درست ہے۔ غذا کا انتخاب اور مقدار کے تعین کا اختیار تمہارے پاس ہے لیکن غذا نہ ہو یا حلق سے نہ اترے، بتاؤ تم کیا کر سکتے ہو؟ مشین کے پرزے اپنے ارادہ و اختیار سے حرکت نہیں کرتے۔ اچھا یہ بتا دو کہ ہم کس منزل کی طرف جا رہے ہیں؟

وقاص نے کہا، موت کی طرف۔ موت ہماری منزل ہے۔ جس دن ہم مریں گے، اس دن سے معدوم ہو جائیں گے۔ مجھے دوسری زندگی کا یقین نہیں ہے اور دوبارہ زندگی کا لطف اٹھانے کا متمنی بھی نہیں ہوں۔ روز لوگوں کو مرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ ان کی زندگی کا چراغ گُل ہو جاتا ہے اور وہ مٹی میں مل جاتے ہیں، مٹی سے اٹھے تھے—مٹی میں مل گئے۔

میں نے فوراً کہا، بہت خوب ! پھر اس طلسمی انڈے کا کیا ہوا؟ ایک انڈا مرغی بن گیا تو مرغی میں دوسرا انڈا کہاں سے آیا؟ انڈا ٹوٹتے ہی انڈے کا وجود ختم ہو جانا چاہئے تھا۔

وقاص کے چہرے پر لکھا تھا کہ وہ اپنی دلیل میں پھنس گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ نئی دلیل ڈھونڈ کر لاتا، میں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

بس بھائی! اب یہ نہ کہہ دینا کہ پہلا انڈا خود وجود میں آیا، باقی مرغی نے دیئے۔ کس قدر نامناسب بات ہے کہ ہمارا آغاز بندر کے نطفے سے ہوا اور خاتمہ دائمی فنا پر ہے۔ پھر مرنے والے خواب میں کیوں آتے ہیں؟ وہ یہاں سے جانے کے بعد کہاں پر زندہ ہیں——؟

اس گفتگو پر میرے بھائی کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ گہری سوچ میں گم ہو گیا جیسے ہار مان لی ہو۔ کافی دیر بعد اٹھا اور کہا، پھر بات کریں گے۔

میں نے آواز دی، یہ تو بتاتے جاؤ کہ پہلے انڈا وجود میں آیا یا مرغی؟ جواب نہیں دیا۔

وقاص کمرے سے جا چکا تھا۔

میں نے جواب تلاش کیا تو پہلے پہل خیال وارد ہوا—— مرغی۔ میرے اندر کسی نے کہا یہ جواب درست نہیں۔ میں نے کہا، انڈا؟ اندر میں کوئی مطمئن نہیں تھا۔ یکایک ذہن کھلا کہ مرغی اور انڈا ایک ہیں۔ وقت اور فاصلے نے نام بدل دیئے ہیں۔ فاصلہ حذف کر دیا جائے تو بتایئے جواب کیا ہوگا اور مرغی اور انڈا کیا ہوئے——؟

(آخری قسط)

★ محترم خواتین و حضرات! آپ نے نیچر اور فطرت کے موضوع پر مضمون پڑھا۔ اس سلسلے میں اظہار کرنا چاہیں یا کچھ لکھنا چاہیں تو ”ماہنامہ قلندر شعور“ میں انشاءاللہ شائع ہوگا۔ (ایڈیٹر)

دنیا میں یہ بحث ہمیشہ سے چلی آ رہی ہے کہ انڈا پہلے یا مرغی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں انڈا۔ کچھ کا کہنا ہے مرغی۔ ایک کو ہم مرغی اسکول یا فرقہ مرغیہ کہہ سکتے ہیں۔ دوسرے کو انڈا اسکول۔ ہمیں انڈا اسکول سے منسلک سمجھنا چاہئے۔ ملت بیضا کا ایک فرد جاننا چاہئے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اگر آدمی تھانے دار یا فقیہ شہر ہو تو اس کے لئے مرغی پہلے اور غریب شہر ہو تو اس کے لئے انڈا پہلے ہے۔ غریب شہر سے بھی گیا گزرا ہو تو نہ اس کی دسترس مرغی تک ہو سکتی ہے نہ انڈا گرفت میں آ سکتا ہے۔ ایک زمانے میں ہمارا دھیان کبھی کبھی مرغی کی طرف جایا کرتا تھا لیکن جب سے بکری کے دام گائے کی قیمت کے برابر ہوئے ہیں اور مرغی بکری کے دام ملنے لگی ہے اور انڈا مرغی کے بھاؤ دستیاب ہونے لگا ہے، ہمارے لئے انڈا ہی مرغی ہے۔ (ابن انشا کی تحریر سے ماخوذ)

# سرورق کی تشریح

اللہ رب العالمین فرماتے ہیں:

"کیا انہوں نے زمین میں سیر نہ کی کہ پس دیکھتے کہ ان سے پہلے کے لوگوں کا کیا انجام ہوا؟ وہ تعداد، قوت اور زمین پر آثار چھوڑنے کے اعتبار سے ان سے بہت زیادہ تھے پس جو کچھ انہوں نے کمایا وہ ان کے کسی کام نہ آیا۔" (المؤمن: ۸۲)

موجودہ دور سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کے لحاظ سے عظیم دور نہیں ہے۔ قرونِ اولیٰ کے لوگوں کے پاس ایسے سائنسی، تکنیکی، تعمیراتی، عسکری و حربی علوم تھے جو ہر لحاظ سے اِس دور کے علوم سے برتر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آثار قدیمہ میں سے اکثر، آج کے محققین کے لئے معمّا ہیں۔

دریائے نیل جسے اکثر مؤرخین اور ماہرین دنیا کے قدیم ترین اور طویل ترین دریاؤں میں سے ایک قرار دیتے ہیں، خالقِ کبریا کے عجائبات میں سے ہے۔ دریائے نیل کا زیادہ تر حصہ لق ودق صحرا میں سے ہو کر گزرتا ہے جس کی وجہ سے آس پاس زرخیز علاقے اور نخلستان ہیں۔ ان میں بہترین فصلیں، اجناس اور پھل پیدا ہوتے ہیں اور صحرائی باشندوں کے لئے خوراک وزراعت اور وسائل کا انتظام ہوتا ہے۔

قدیم مصر میں فراعنہ نے دریائے نیل کے کنارے مختلف مقامات پر محلات، عبادت گاہیں، مقبرے اور سیرگاہیں تعمیر کی تھیں۔ ان میں غزہ اور القصر کے آثار آج بھی مشہور ہیں۔

فراعنہ مصر سے پہلے انبیائے کرام حضرت ادریسؑ، حضرت یوسفؑ اور حضرت لقمانؑ نے اہرام کی حیرت انگیز تعمیراتی ٹیکنالوجی متعارف کروائی جو خوراک و اجناس کو طویل مدت تک محفوظ و مامون رکھ سکتی ہے۔ محقق اور آثار قدیمہ کے ماہرین کو اہرام سے زرعی اجناس اور غلّے کے ایسے نمونے ملے جو ہزاروں سال گزرنے کے باوجود جراثیمی حملے اور کائی لگنے سے نہ صرف محفوظ تھے بلکہ غذائیت بھی برقرار تھی۔ اس وجہ سے فراعنہ نے بعد ازاں اہرام میں اپنے لئے مقبرے بنوائے تاکہ ان کی لاش محفوظ رہے۔

قدیم زمانے کے سائنس و ٹیکنالوجی کے علوم ہوں یا موجودہ دور کے، سب میں قدرِ مشترک ہے کہ یہ

فطری ماحول میں کارفرما قدرتی عوامل کے مطالعے اور ان کی نقل ہیں۔ فطری عوامل کی نقل جتنے بہتر انداز میں ہوتی ہے، سائنسی علم اتنا ہی جدید اور ترقی یافتہ کہلاتا ہے۔ جیسا کہ پرندوں کی پرواز کے مطالعے سے ہوائی جہاز ایجاد ہوئے۔ پروں کی ساخت کے مختلف انداز اور ہوائی حرکیات (Aerodynamics) میں جس قدر مطالعہ گہرا ہوا، ہوائی جہاز جدید سے جدید تر بنتے گئے۔ مچھلیاں اور دیگر آبی جانور، پانی میں اچھال کی قوت اور مختلف اجسام کی کمیت و کثافت، سطحی رقبے اور حجم وغیرہ کے مطالعے سے بھاری بھر کم بحری جہاز اور آبدوزیں بنیں۔ یعنی سائنس میں جو کچھ ایجاد ہوا ہے اور وقت کے ساتھ اس ایجاد کو جس طرح بہتر سے بہتر کیا گیا ہے، سب فطرت کی نقل ہے۔

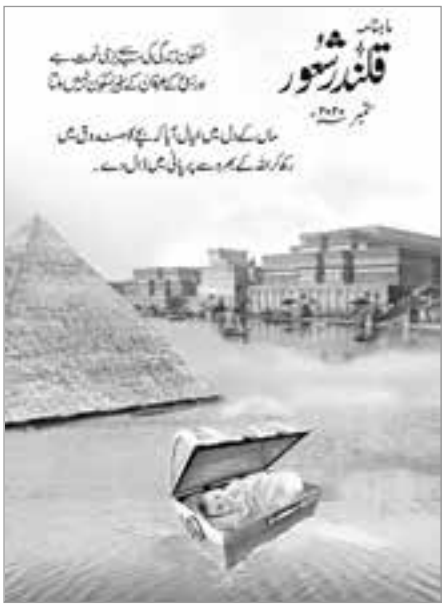


نباتات کی دنیا پر غور کریں تو آبی پودے پانی میں گلنے سڑنے کے خلاف بہترین مدافعت رکھتے ہیں کیوں کہ وہ عمر بھر پانی میں رہتے ہیں۔ مصریوں نے ان پودوں کو دریائے نیل میں نقل و حمل کے لئے کشتیوں وغیرہ کی تیاری میں استعمال کیا اور مزید دافع آب مرکبات کی تہ چڑھا کر ان کو محفوظ کیا۔ اہرام مصر میں موجود ممیوں، کشتیوں اور دیگر ساز و سامان پر لیپ مختلف رنگوں کے مرکبات میں موسمی و جراثیمی اثرات سے محفوظ رہنے کی خصوصیات ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم مصری دیگر علوم کے ساتھ علمِ کیمیا پر دسترس رکھتے تھے۔

حضرت موسیٰؑ کی والدہ محترمہ کا، بیٹے کو سرخ روغن میں رنگے، دریائے نیل میں پیدا ہونے والے نرسل سے بنے صندوق میں رکھ کر دریا کے حوالے کرنا، علاوہ ازیں فراعنہ کے عالی شان محلات اور انبیائے کرام کے علوم کے تحت تعمیر ہونے والے اہرام کی، ستمبر 2020ء کے ”ماہنامہ قلندر شعور“ کے سرورق پر تصویر کے ذریعے عکاسی کی گئی ہے۔ خصوصاً بچے کے چہرے پر اطمینان و سکون ظاہر کرتا ہے کہ بچہ 70 ماؤں سے زیادہ محبت کرنے والی ہستی، اللہ رب العالمین کی خصوصی رحمت کے حصار میں محفوظ رہا۔ (ح۔ا۔پ)

ستمبر 2020ء کے سرورق پر صندوق کو دریائے نیل میں ڈالنے کا واقعہ ہے۔ اسی شمارے میں سرورق سے متعلق مضمون پڑھا جس میں تحقیقی انداز میں توجیہ پیش کی گئی ہے۔ سمندر ہماری طرح مخلوق اور نوع ہے۔ پورے واقعے میں سمندر کے نوعی شعور کو بیان کیا گیا ہے۔ اگر ہمیں کسی مخلوق کے ہاتھ پیر، آنکھیں، سر، کان، کندھے، کمر، ریڑھ کی ہڈی، دل اور دماغ وغیرہ نظر نہیں آتے تو ہر گز یہ مطلب نہیں کہ وہ جان دار مخلوق نہیں۔ یہ اعضا ہر مخلوق میں ہیں۔ دریا کی جسامت مختلف ہے اس لئے دریا کے اعضا کی اشکال ہم سے الگ ہیں مگر یاد رکھنا چاہئے کہ ہمارے اعضا اور وجود پانی سے بنے ہیں۔ پھر کیوں کر ممکن ہے کہ پانی کی اپنی شکل میں یہ اعضا نہ ہوں ــــ؟ دریا نے ایک وجود بن کر اس کا مظاہرہ کیا۔ ایک کنارے سے لے کر دوسرے کنارے پر موجود لہروں کو علم تھا کہ صندوق کو مقررہ منزل پر پہنچانا ہے۔

دریا کی روانی تیز ہوتی ہے، لہریں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہوئی زور و شور سے آگے بڑھتی ہیں۔ ایسے پانی میں صندوق کے وزن کی شے اور بچے کے وزن کا سامان رکھیں تو ممکن ہے وہ الٹ جائے مگر دریائے نیل نے حفاظت سے اور مختلف طبیعی قوانین استعمال کر کے صندوق کو بحفاظت محل کے تالاب تک پہنچایا۔

قوانین کا ذکر مضمون میں آٹھ نکات میں کیا گیا ہے۔ جیسے پانی کا بچے کی حفاظت کرنا۔ یہ مکمل قانون ہے اور حفاظت کے ضمن میں جتنے وسائل زیر بحث آتے ہیں وہ سب یہاں فعال ہیں۔ پھر لہروں کا صندوق کو دھکیلنا۔ اس میں کشش اور گریز کا قانون متحرک ہے۔ لہروں کا رخ محل کی طرف ہونا۔ معلوم نہیں اس سے پہلے ان لہروں کا رخ کس جانب ہو۔ جن لہروں کو ذمہ داری سونپی گئی تھی، انہوں نے عارضی طور پر وہ سمت ترک کر کے محل کا رخ کر لیا۔ باقی دریا نے ذمہ داری کی انجام دہی میں معانت کی اور دخل اندازی سے گریز کیا۔ صندوق کا ڈوبنے سے محفوظ رہنا بھی قانون کے تحت ہے۔ میری دانست میں اس قانون میں ہوا، وزن اور گیسوں کا عمل دخل ہے اس طرح کہ صندوق کشتی بن گیا۔ لکھنے کو بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے کہ اس ایک واقعہ میں طبیعیات، کیمیا، حیاتیات وغیرہ کے طالب علموں کے لئے تحقیق کو بہت کچھ ہے۔

مختصر یہ ہے کہ دریا کو اپنی طرح کے وجود کی حیثیت میں دیکھیں تو دیکھنے کا زاویہ تبدیل ہو جائے گا اور ہر شے یہاں ہماری طرح کی نوع محسوس ہو گی۔ (جویریہ ودود۔ کراچی)

عرفانہ شہزاد

# کِس نے کہا اور کِس نے سنا

پُرسکون ماحول، تازگی اور نورانیت اس جگہ سے صدیوں کی انسیت کا پتہ دیتی تھی۔ رنگ رنگ پھولوں سے بھرے گلستان نے ہمارا استقبال کیا۔ یہ جگہ ہمیں ..... لگی۔ ترتیب، نفاست اور خوب صورتی شاہد تھی کہ گلستان کو بڑی محبت سے آراستہ کیا گیا ہے۔

---

یہ شہر جہاں میں پیدا ہوئی، مجھے اس سے انسیت تھی کہ ایک عمر یہاں گزاری ہے، راہ نما کے یہاں سے روانہ ہوتے ہی یک دم بے رونق اور ویران ہو گیا۔ دل بے قرار — آنکھیں اشکوں سے تر تھیں۔ وقت تھم گیا تھا۔ راہ نما کو شہر سے گئے دو ماہ ہو چکے تھے۔ کیفیت کا عکس خواب میں منتقل ہوا تو جواب، خواب کے ذریعے ملا۔

حکم ہوا — بھائی کے ساتھ آجاؤ۔

والد نے فراخ دلی سے جانے کی اجازت دے دی، اس بار والدہ کی طرف سے مخالفت ہوئی۔ بھائی بھی دید کا خواہاں تھا۔ ہم دونوں بہن بھائیوں نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ والد کو مطمئن دیکھ کر بالآخر والدہ مان گئیں۔ ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا اور تیاری میں مصروف ہو گئے۔

راہ نما کا قیام جس شہر میں تھا، بچپن میں ایک بار وہاں جانا ہوا۔ ہوٹل کی کھڑکی سے روشنیوں سے جگمگاتے ہوئے شہر کو دیکھ کر ایسا لگا کہ ہم اپنے شہر سے بہت دور آ گئے ہیں۔ سوچا نہیں تھا کہ یہ شہر کبھی دل میں بس جائے گا۔

ادب کا سفر مادی راستوں پر نہیں دل میں طے ہوتا ہے۔ راستے کی طوالت معانی نہیں رکھتی۔ آدمی مہینوں ہمسائے کے گھر نہیں جاتا مگر عقیدت کی شاہراہ پر میلوں میل سفر کرتا ہے اور تھکتا نہیں ہر بار نئے عزم سے ہمکنار ہوتا ہے۔

فاصلے سمٹ گئے تھے۔ محسوس ہوا کہ جیسے ہی دروازہ کھلے گا، منزلِ مقصود سامنے ہو گی۔

مقررہ روز ریل گاڑی میں سوار ہوئے۔ اپنے شہر سے راہ نما کے شہر کا راستہ عقیدت و احترام اور ادب میں گزرا۔ ادب و محبت کا راستہ سیدھا چوکھٹ

تک پہنچاتا ہے۔ نظر بھٹکتی ہے نہ خیال۔ ہر سانس میں مہک اور خیر و برکت شامل ہوتی ہے۔

میں نے راستوں کو مسکراتے اور درختوں کو ہاتھ ہلاتے دیکھا۔ آگے بڑھتی ریل گاڑی اور پیچھے جاتے مناظر عجیب لطف دے رہے تھے۔ دل کہہ رہا تھا کہ قیمت بے قیمت کرنے سے ہی گوہرِ مقصود حاصل ہوتا ہے۔

عجب آشفتہ سری (دیوانگی) تھی جو خود سے بے خود کر رہی تھی۔ اندر کی کیفیت باہر کے مناظر پر طاری تھی۔ لگتا تھا کہ ان سے ملنے کی خوشی میں ریل گاڑی کی پٹڑی لپٹ رہی ہے۔

علم کا راستہ، تسلیم و رضا کا راستہ ہے۔ میں نے سوچا کہ پتہ نہیں وہ کیا بات کریں گے؟ دل نے فیصلہ کیا کہ وہ جو کہیں، سمجھ میں آئے یا نہ آئے، ہمیں تعمیل کرنی ہے۔ ریل گاڑی کی آواز اندر کی صدا میں ڈھل گئی۔

سفر میں بعض مقامات پر مٹی اور ریت کے ذرّات اٹھے، کھڑکی کھلی تھی، ہم بصد شوق کھلی کھڑکی کے پاس بیٹھے تھے، چہرے اور بال مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی حلق میں مٹی کا ذائقہ محسوس ہوتا۔ احساس ہوا کہ مٹی میں کوئی خاص بات ہے جو لطف دیتی ہے۔

اپنی ڈائری کھولی، لکھا تھا:

سر میں دھول چہرۂ تاباں پر دھول
مہکتی ہوئی دھول کے لباس میں مستور ہوں
یہ غبارِ خاک ہے یا غبارِ خاص ہے
اس رہِ یار کی مٹی میں مسرور ہوں

یوں پہلا مرحلہ تمام ہوا اور شہر کو سلام ہوا۔

ریلوے اسٹیشن سے منزلِ مقصود تک سفر بھی یادگار ہے۔ نظر بار بار آسمان کی طرف اٹھتی اور شکر بجالاتی۔ گاڑی مختلف علاقوں سے گزر رہی تھی اور میں اس شہر کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے پہلی بار کوئی شہر دیکھا ہو۔ پھر دور سے قطار در قطار گہرے سبز درختوں کے بیچ سفید عمارت دکھائی دی۔ جن راستوں سے گزر کر ہم آئے تھے، ان میں یہ علاقہ منفرد تھا۔ سچ کہتے ہیں کہ اللہ والے ویرانے آباد کر دیتے ہیں۔ وہ جہاں ہوتے ہیں، اللہ کی محبت کی خوش بو پھیلا دیتے ہیں۔ مخلوق خوش بو کی کشش میں جوق در جوق آتی ہے اور جنگل میں منگل ہو جاتا ہے۔

ٹیکسی مرکزی دروازے پر رکی جہاں سنہری زنجیر کے ساتھ بڑی گھنٹی آویزاں تھی۔ زمانہ جدید میں قدیم یادگار —— دل کو اچھی لگی۔ گھنٹی بجاتے ہی ٹن ٹن کی گونجار سے خاموش فضا میں جلترنگ ہو گئی۔ دروازہ کھلا —— نظر بڑی راہداری کے آخر میں جالیوں تک گئی اور قدم رک گئے۔ بتایئے جب

کوئی خواب میں دیکھا ہوا مقام بیداری میں دیکھ لے تو کیفیت کیا ہوگی——؟

چپے چپے سے سرشاری جھلک رہی تھی۔ اپنائیت کا احساس تھا۔ پُرسکون ماحول، تازگی اور نورانیت اس جگہ سے صدیوں کی انسیت کا پتہ دیتی تھی۔ رنگ رنگ پھولوں سے بھرے گلستان نے ہمارا استقبال کیا۔ یہ جگہ ہمیں .........لگی۔ ترتیب، نفاست اور خوب صورتی شاہد تھی کہ گلستان کو بڑی محبت سے آراستہ کیا گیا ہے۔

ہمارا قیام مہمان خانے میں تھا۔ سامان رکھا اور تازہ دم ہوئے۔ گھنٹے کی جلترنگ گونجی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ کے ساتھ جلترنگ کا تاثر ہمارے لئے نیا تھا۔ معلوم ہوا کہ کھانے کے لئے لنگر خانے میں آنے کی اطلاع گھنٹے کے ذریعے دی جاتی ہے۔ لنگر خانے گئے۔ یہ صاف ستھرا کشادہ کمرا تھا، دریاں بچھی ہوئی تھیں اور دسترخوان پر ترتیب سے کھانا چنا گیا تھا۔ کھانے میں روٹی سالن کے ساتھ اچار، چٹنی، سلاد اور میٹھے میں گڑ تھا۔ خوش بو سے بھوک بڑھ گئی۔ بہت سنا تھا کہ لنگر میں شفا ہے۔ ہر نوالے کے ساتھ ایسا لگا کہ خوشیاں داخل ہو رہی ہیں۔

نگاہیں راہ نما کو تلاش کر رہی تھیں۔ محسوس ہوا کہ وہ آس پاس ہیں اور ہمیں دیکھ کر تبسم فرمارہے ہیں۔ سچ ہے کہ ماحول پر ملکوتی مسکراہٹ محیط تھی اور یہی وہ مقناطیس تھا جس کی بنا پر یہاں آنے والوں کو یکسوئی حاصل ہے۔

کھانے کے بعد ہم انتظامیہ کے آفس گئے۔

وہاں استفسار ہوا کہ آپ لوگ کام کریں گے یا آرام کریں گے؟

ہم نے فوراً کہا، جی، کام کریں گے۔

ہمیں ایک کمرے میں لے جایا گیا جہاں بڑی میز پر خطوط کے ڈھیر (جو راہ نما کے نام تھے) کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ڈیوٹی دی گئی کہ خط کھول کر کاغذ سیدھا کریں اور جوابی لفافے کو کامن پن کی مدد سے خط کے ساتھ منسلک کر دیں۔

یہ پریشان حال لوگوں کی جانب سے مسائل اور الجھنوں سے متعلق خطوط تھے تاکہ اللہ کے دوست مسائل سے نکلنے کی راہ تجویز کریں۔

ہمیں حیرت ہوئی کہ جن خطوط کو کھولنے کے لئے کئی لوگ ہیں، راہ نما تنہا ان کو پڑھ کر جواب کیسے دیتے ہیں۔

دو تین بار جی چاہا کہ خطوط پڑھ لوں مگر یہ سوچ کر توجہ تبدیل کی کہ ہمارا کام لفافہ کھولنا ہے، پڑھنا نہیں، پڑھ لیا تو خیانت ہوگی۔

ڈیوٹی پر موجود بہن بھائیوں نے بتایا کہ ایسا کبھی

نہیں ہوا کہ راہ نما نے اپنے نام آنے والا کوئی خط نہ پڑھا ہو۔ یہ سن کر دل نے کہا، جو لوگ اللہ کی رضا کی خاطر خود کو خدمت کے لئے وقف کر دیتے ہیں، ان کے در سے سائل خالی ہاتھ نہیں لوٹتا۔

معلوم ہوا کہ بزرگ بیرون ملک دورے پر گئے ہوئے ہیں ۔ ہمیں یقین نہیں آیا۔ وجہ یہاں ان کی موجودگی کے احساس میں شدت تھی۔

ہمارے چہرے پر بے یقینی کے تاثرات دیکھ کر جب کہا گیا کہ آپ کو آنے سے پہلے معلوم کر لینا چاہئے تھا تو مزید حیرت ہوئی کیوں کہ اجازت سے ہی آنے کی راہ ہموار ہوئی تھی ۔ ہم یہاں کے اصول و ضوابط سے واقف نہ تھے۔ ایڈریس کی پرچی لے کر گھر سے تین دن کی اجازت کا پروانہ لیا اور عازم سفر ہوئے۔

ذہن تاریکی میں ڈوبتا محسوس ہوا۔ بھائی نے مجھے اور میں نے بھائی کو دیکھتے ہوئے سوچا کہ اگر ہم ملاقات سے محروم رہ گئے تو کیا ہوگا—؟ بہر حال خدشات کے باوجود دل کو یقین تھا کہ ملاقات طے ہے۔ آنکھیں بند کر کے اور قلب میں اتر کر رحیم و کریم اللہ سے دعا کی۔ قسمت نے یاوری کی اور اسی شام راہ نما تشریف لے آئے۔ اچانک آمد پر سب کے اندر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

ان کے کمرے کے باہر تخت کے سامنے لوگوں کے بیٹھنے کے لئے بڑی چٹائی بچھا دی گئی۔ چہرے خوشی سے دمک اٹھے۔ گاڑی دروازے پر پہنچی تو سب کے ساتھ میر ابھائی بھی مرکزی دروازے کی طرف گیا—ایک میں تھی کہ خطوط کے ساتھ بیٹھی رہی۔ ذہن خالی تھا۔ کسی نے آکر کہا، بہن! شام ہوگئی ہے، کام روک دیں۔ بزرگ تشریف لے آئے ہیں۔ آپ باہر آجایئے۔

بعض اوقات ہم خود سے لاعلمی کی بنا پر اپنے آپ کو سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔ اس لمحے مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں اپنے آپ سے آگاہ نہ تھی۔ کہاں اتنا یقین اور اب بے یقینی کی کیفیت۔ اگر اتنے لوگوں میں انہوں نے نہیں پہچانا پھر؟ خوف کا دباؤ بڑھنے سے سانسیں رکی ہوئی محسوس ہوئیں۔

ٹوٹے پھوٹے قدموں سے باہر آئی—اور پہلی نظر میں بے یقینی دور ہوگئی۔ انہوں نے سر پر دست شفقت رکھا اور دعا دی۔ نہ صرف پہچان لیا بلکہ نام بھی یاد تھا۔ بس پھر کیا تھا، عید ہوگئی۔

ایک بھائی کو ہمارے قیام کے بارے میں استفسار کے لئے طلب کیا۔

میں نے عرض کیا، رہائش کا انتظام ہوگیا ہے۔

سر کو ہلکا سا خم دیتے ہوئے مسکرائے اور فرمایا، ٹھیک ہے، گھومو پھرو، کھاؤ پیو، خوش رہو۔

بات سنتے ہی ذہن میں آیت گونجی:

''اور ہم نے آدم سے کہا، اے آدم ! تم اور

تمہاری زوج جنت میں رہو اور جہاں سے جی چاہے خوش ہو کر کھاؤ پیو۔" (البقرۃ:۳۵)

کویل کی کوک سے آنکھ کھلی۔ مہمان خانے سے وضو خانے کا رخ کیا۔ نظر آسمان کی طرف گئی۔ دیکھا کہ چاند بہت دور آسمان پر ہے لیکن زمین پر کرنوں کی چادر ہے۔ یہ دوری ہے یا قربت یا قربت دوری بن گئی ہے؟

کویل کی سریلی کوک دوبارہ سنائی دی۔ تلاش کرنے پر قریب موجود درخت پر بیٹھی ہوئی نظر آگئی۔ خوش الحان پرندے کی قسمت پر رشک آیا کہ اس کا مسکن یہ گلستان ہے جہاں اللہ کے ایک دوست مخلوق کو علم، امن، احترام انسانیت اور اللہ سے محبت کا درس دیتے ہیں۔

آگے بڑھی تو رات کی رانی اور چنبیلی کی گہری خوش بو، پُر کیف ہوا اور لطیف فضا نے وجدانی کیفیت طاری کر دی۔ سپیدۂ سحر سے قبل خمار آلود اندھیرے میں راہ نما کا کمر اسچے موتی کی طرح چمک رہا تھا۔ باغ میں مخملی گھاس پر غنودگی طاری تھی۔ محسوس ہوا کہ پھول، پتّے، پودے اور درخت مراقب ہیں جب کہ رات جاگ رہی ہے۔

میں رات کے آخری پہر کی مدہم روشنی میں بیٹھ گئی اور رات کو مخاطب کیا:

اے خانقاہ کی حسین رات!

کیا تو بتائے گی تیرے اندر کون کون سے اسرار چھپے ہوئے ہیں ــــ؟ تو خوش نصیب ہے کہ فقیر کے در پر رہتی ہے۔ اس کے ساتھ حمد و ثنا کرتی ہے، خوش رہتی ہے اور ہر دکھ سے آزاد ہے۔ تجھے کیا بتاؤں کہ یہاں سے باہر کی راتیں عذاب ہیں۔

اے خانقاہ کی مہربان رات!

تجھے ایک راز کی بات بتاتی ہوں کہ تیرا اندھیرا، اندھیرا نہیں، روشنی ہے۔ میری طرح تجھے بھی اپنا تشخص روشنی سے ملا۔ رات کے راہی جب دل کی گلیوں میں راستہ تلاش کرتے ہیں تو آشنائے راز کا مسکن درست سمت کی نشان دہی کرتا ہے۔ منزل کے نشان آستانے کی چوکھٹ سے ملتے ہیں۔

اے خانقاہ کی پُر نور رات!

تیرے سکوت میں صوتِ سرمدی کو سننے کی حس بیدار ہوتی ہے، وعدۂ الست کی یاد تڑپ بن جاتی ہے، خالقِ کائنات اللہ کی بندگی اور محبت کی کشش جسم و جان سے بے نیاز کرنے لگتی ہے۔

اے نقطے میں بند سیاہ رات!

تیری آغوش میں ہزار رنگ پھولوں کی طرح ہمارے رنگ روپ، نقش و نگار، نسل اور افتادِ طبع الگ الگ ہے مگر اندر میں ہم ایک ہیں۔ تو ہماری شماریات سے زیادہ نفوس کو اپنی آغوش میں سمیٹ

کر اپنا ہم رنگ کر دیتی ہے۔

اے یادِ الٰہی میں بیدار مقدس رات!

تیرا تشخص محبوب کے وصل سے ہے۔ جاگتی ہوئی رات تُو گراں قدر ہے۔ ہزار راتیں نظروں سے اوجھل ہوتی ہیں تو شبِ وصال مسکراتی ہے۔

اے وصل کی تڑپ بڑھانے والی رات!

تیرا ذکر تو کلام پاک میں ہے۔ اللہ نے رات میں عبادت کی فضیلت بیان کر کے تجھے معرفت کے حصول کا ذریعہ بنایا ہے۔ تیرے ساتھ جاگ کر بندہ تاریکی سے روشنی میں داخل ہوتا ہے۔

اے وجد میں ڈوبی ہوئی رات!

تیرا اندھیرا اندر باہر کے بت توڑ دیتا ہے۔ کوئی شے چھوٹی یا بڑی نہیں رہتی۔ نقش و نگار معدوم ہو جاتے ہیں۔ صرف حس باقی رہتی ہے جو خدائے واحد کی محبت کو محسوس کرتی ہے۔

اے خانقاہ کی حسین رات!

قدرت مجھے فقیر کے در پر لائی ہے جو میرے حواس کو تیرے حواس سے ہم آغوش کر کے لاشعور کے راستے کھولے گا اور میری ویران راتوں کو اللہ کی یاد سے آباد کر دے گا۔

یہ سن کر رات شبنم بنی اور شبنم ماحول کے پیراہن میں جذب ہو گئی۔ (قسط:۴)

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں
ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
جو یاد نہ آئے بھول کے پھر
اے ہم نفسو! وہ خواب ہیں ہم
میں حیرت و حسرت کا مارا
خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے
آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم
ہو جائے بکھیڑا پاک کہیں
پاس اپنے بلالیں بہتر ہے
اب درد جدائی سے ان کی
اے آہ! بہت بیتاب ہیں ہم
اے شوق برا اس وہم کا ہو
مکتوب تمام اپنا نہ ہوا
واں چہرہ پہ ان کے خط نکلا
یاں بھولے ہوئے القاب ہیں ہم
اے شوق پتا کچھ تو ہی بتا
اب تک یہ کرشمہ کچھ نہ کھلا
ہم میں ہے دل بے تاب نہاں
یا آپ دل بے تاب ہیں ہم
لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں
منزل پہ پہنچتے ہیں دو ایک
اے اہل زمانہ قدر کرو
نایاب نہ ہوں کم یاب ہیں ہم
مرغان قفس کو پھولوں نے
اے شادؔ یہ کہلا بھیجا ہے
آ جاؤ جو تم کو آنا ہو
ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

(کلام: شادؔ عظیم آبادی)

# لوبان

لوبان کی 19 اقسام ہیں جن میں اس کے درخت کی سات نادر اقسام بھی ہیں جو یمن، جزیرہ سماٹرا، عمان کے جنوبی علاقے، ایتھوپیا، سوڈان، جزیرہ مڈگاسکر اور ہندوستان میں پائی جاتی ہیں۔

قدیم زمانے سے رواج ہے کہ کعبہ شریف کے اندر باہر عود، صندل اور لوبان کی دھونی دی جاتی ہے۔ لوبان کم و بیش تمام قدیم تہذیبوں کا حصہ رہا ہے۔ ان میں حضرموت کے علاوہ ثمودیوں اور انباط کی مملکتیں شامل ہیں۔ حضرموت قدیم مملکت تھی جو اب موجودہ یمن میں شامل ہے جب کہ انباط Nabataeans ہیں جو شمالی عرب کے قدیم لوگ تھے اور عرب اور شام کے درمیان دریائے فرات سے بحیرہ احمر تک آباد تھے۔

ایک عرب ملک کی یونی ورسٹی میں آثار قدیمہ کے ماہر کا کہنا ہے:

" جزیرہ عرب کے ہر حصے میں خوش بویات کی اہمیت ہے۔ یہاں عجائب خانے ہر شکل اور رنگ کے دھونی دانوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہ دھونی دان پتھر، مٹی اور معدنیات کے بنے ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں گھر میں دھونی دینا عرب ثقافت کا اہم جزو ہے۔ ہر تہذیب میں دھونی کو مذہبی اہمیت حاصل رہی ہے۔"

دھونی دینے کے لئے عموماً جس خوش بو کا بکثرت استعمال ہوتا ہے وہ لوبان ہے۔ یہ خوش بو گھروں، دکانوں، بازاروں (خاص طور پر عرب ممالک کے بازاروں میں) اور خانقاہوں میں ہمارا استقبال کرتی ہے۔ اس کی مہک سرایت کرنے سے وجود ہلکا ہوتا ہے اور ذہن بوجھ سے آزاد ہو جاتا ہے۔

جو لوگ ماورائی اور غیر ماورائی مسائل کی شکایت کرتے ہیں، انہیں کھانے میں نمک کی کمی کے ساتھ عصر اور مغرب کے درمیان لوبان کی دھونی دینے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ لوبان کی تاریخی حیثیت اور خصوصیات کا مضمون میں جائزہ لیا گیا ہے۔

بلوط کے درخت سے ملتا جلتا کانٹے دار درخت جس کا تنا موٹا، پتّے املی کے پتّوں جیسے اور پھل گول اور سرخ ہوتا ہے۔ اس درخت کو ضرو کہتے ہیں۔ درخت کی چھال میں شگاف سے بیروزے کی مانند

گاڑھا لیس دار مادہ یا گوند خارج ہوتی ہے جسے سکھا کر استعمال کرتے ہیں۔ یہ گوند لوبان ہے۔ جب گوند کے مختلف ڈلے آپس میں ملتے ہیں تو اسے کوڑیا لوبان کہتے ہیں۔ کوڑیا لوبان خالص اجزا پر مشتمل ہے اور دھونی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جن علاقوں سے یہ گوند حاصل کی جاتی ہے وہاں زمین اور علاقائی ماحول کے اختلاف کی وجہ سے لوبان کی خوش بو اور رنگ میں معمولی فرق ہے مگر فوائد تقریباً ایک جیسے ہیں۔

طب نبویؐ میں بھی لوبان کا تذکرہ ہے۔

حصرت عبداللہ بن جعفرؓ سے روایت ہے:

"رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ اپنے گھروں کو لوبان اور صعتر کی دھونی دیتے رہا کرو۔"

لوبان دافع تعفن اور جراثیم کش ہے۔ حضور پاکؐ کے ارشاد گرامی پر تحقیق کی جائے تو ذہنی و جسمانی بیماریوں کے علاج میں حیرت انگیز پیش رفت ہوگی کیوں کہ جس قدرتی شے میں جراثیم دور کرنے کی صلاحیت ہو، اس کے مناسب استعمال سے ہر بیماری کے جراثیم ختم ہوسکتے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ پر نازل ہونے والی کتاب توریت میں ایک خوش بو "بخور" بنانے کی ترکیب بیان کی گئی ہے جس کے اجزا میں لوبان شامل ہے۔

"اور خداوند نے موسیٰؑ سے کہا، تو خوش بو دار مسالے، مُر اور مصطکی اور لون کے ساتھ خوش بو دار خالص لبان وزن میں برابر لینا اور نمک ملا کر ان سے گندھی کی حکمت کے مطابق خوش بو دار روغن کی طرح صاف اور پاک بخور بنانا۔"

(توریت: کتاب خروج، باب ۳۰: ۳۴۔۳۵)

مسیحی روایات کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کو بچپن میں تین قیمتی تحائف پیش کئے گئے تھے جن میں سے ایک لوبان تھا۔ اس زمانے میں لوبان اور سونے کی قیمت تقریباً ایک تھی۔

"اس گھر میں پہنچ کر بچے کو اس کی ماں مریمؑ کے پاس دیکھا اور اسے تعظیم پیش کی اور اپنے ڈبے کھول کر سونا، لبان اور مُر اس کو نذر کیا۔"

(انجیل۔ متی، باب ۲: ۱۱۔۱۲)

ملک عمان میں لوبان کی تجارت صدیوں پرانی ہے۔ سینکڑوں اونٹوں اور قافلوں پر خوش بو یات کے تجارتی قافلے یہاں سے مصر، بابل، یونان اور سلطنت روم تک جاتے تھے۔

لوبان کے گوند کی قیمت کا تعین اس کے رنگ، حجم (سائز) اور اس میں موجود تیل کی مقدار سے ہوتا ہے۔ عمان کے ماہر تعلیم و محقق ڈاکٹر احمد بن سلیمان الحراصی کہتے ہیں:

"لوبان کی 19 اقسام ہیں جن میں اس کے درخت کی سات نادر اقسام بھی ہیں جو یمن، جزیرہ سماٹرا،

عمان کے جنوبی علاقے، ایتھوپیا، سوڈان، جزیرہ مڈگاسکر اور ہندوستان میں پائی جاتی ہیں۔ اس گوند کی سب سے قیمتی قسم "ہوجاری" عمان میں ظفار پہاڑوں پر پائی جاتی ہے۔ کارٹیزون کی موجودگی سے لوبان ذہنی تناؤ، دمہ اور کھانسی میں اینٹی بائیوٹک کا کام کرتا ہے۔"

یورپ میں لوبان سے واقفیت اس وقت شروع ہوئی جب ابن بطوطہ سیاحت کے دوران اسے یورپ لے کر گیا۔ آج یورپ کے کئی ممالک میں مذہبی رسومات اور جنازوں پر لوبان کا استعمال عام ہے۔ پرانی قبروں میں ایسے برتن ملے ہیں جن کے سروں میں چھید تھے اور چارکول بھرا جاتا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ دھونی دینے کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ 2014ء میں ان برتنوں پر تحقیق کی گئی کہ ان میں کیا شے جلائی جاتی تھی۔ پتہ چلا کہ صدیوں سے استعمال ہونے والے یہ برتن لوبان کی دھونی دینے کے لئے تھے۔ برتنوں میں لوبان کے علاوہ دیگر خوش بویات پائی گئیں جو ان علاقوں میں ملتی ہیں۔ محققین کا خیال ہے کہ لوبان کے ساتھ دوسری خوش بو کے استعمال کی وجہ لوبان کی قیمت ہے کیوں کہ قدیم زمانے میں یہ بہت مہنگا تھا۔

کرشماتی اثر رکھنے والے لوبان پر کافی عرصے سے تحقیق کی جارہی ہے۔ اس کے دھوئیں میں موجود ذرّات بہت چھوٹے ہونے سے ناک کے اندرونی حفاظتی نظام سے گزر جاتے ہیں۔ ابتدا میں اس امر پر تحفظات کا اظہار کیا گیا۔ بعد میں مزید تحقیق سے ثابت ہوا کہ لوبان کا دھواں مضرِ صحت نہیں۔

اب ایک ایسی تحقیق پڑھئے جس کے بارے میں محقق پُرجوش ہیں اور محتاط بھی۔ یہ کینسر کے خلاف لوبان کے اثرات پر مبنی ہے۔ 2000ء سے تحقیقی جرنلوں میں لوبان کی کینسر کے خلاف مدافعت پر تحقیقات شائع ہورہی ہیں جن کے مطابق اس گوند کے چند اجزا انسانی جین اور ڈی این اے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان میں بہتری پیدا کرتے ہیں۔ یہ گوند رسولی کی بیماریوں کے علاج میں مددگار ہے۔ محقق بتاتے ہیں کہ بقا کے لئے ضروری مدافعتی نظام کو لوبان کے ذریعے تقویت ملتی ہے۔

مخصوص تیزابیت کی موجودگی لوبان کے تیل میں کینسر اور رسولی کے خلاف مدافعت کا سبب سمجھی جاتی ہے۔ 2018ء میں سرطان سے متاثرہ مثانے کے خلیوں پر لوبان کے تیل کے اثرات کا جائزہ لیا گیا۔ نتائج سامنے آئے کہ تیل نے کینسر سے متاثر اور غیر متاثر خلیوں میں امتیاز کیا اور صرف ان خلیوں کو بڑھنے سے روک دیا جو کینسر زدہ تھے۔ دلچسپ بات ہے کہ تیل نے مثانے کے غیر کینسر زدہ خلیوں پر اثرات مرتب نہیں کئے۔

2016ء میں کی گئی تحقیق کے مطابق لوبان کے تیل میں ایسے اجزا موجود ہیں جو فنگس کے خلاف مدافعت رکھتے ہیں اور مدافعت کے لئے لوبان کی

بہت کم مقدار بھی کافی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ لوبان کے تیل سے سوجن دور ہوتی ہے اور یہ تیل جلد کے لئے فائدہ مند ہے۔ لوبان کی دھونی، سفوف اور اس گوند سے بننے والی ادویات نظام ہضم سے لے کر پیر کے تلووں تک، کئی بیماریوں کا علاج ہے۔

روحانی علاج میں لوبان کی دھونی کی اہمیت ہے کیوں کہ یہ منفی اثرات ختم کر کے مثبت فضا پیدا کرتا ہے۔ روحانی علاج میں تعویذ پہننے سے پہلے لوبان کی دھونی دینے کی ہدایت کی جاتی ہے اور بعض تعویذ ایسے ہیں جن کو ہر ہفتے دھونی دینا ضروری ہے۔ گھر کی فضا سے منفی اثرات دور کرنے کے لئے لوبان یا بخور کی دھونی دی جاتی ہے۔ جادو اور سفلی اثرات سے بچاؤ کے لیے پسے ہوئے لوبان پر مخصوص تعداد میں سورہ فلق پڑھ کر دم کر کے روز لوبان کی دھونی دینے سے مکان اور مکینوں کی حفاظت ہوتی ہے۔

محترم عظیمی صاحب فرماتے ہیں:

" لوبان میں ایسی خوش بو ہے جس کو جراثیم پسند نہیں کرتے اور اس خوش بو کی وجہ سے جگہ چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ زیادہ تر فضا صاف کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ماحول خوش گوار اور لطیف ہو جاتا ہے۔ ذہن لوبان کی خوش بو کو قبول کرتا ہے۔ بہت زیادہ سیلن ہو اور لوبان جلائیں تو سیلن ختم ہو جاتی ہے۔ بیماریاں غیر حقیقی سوچ سے پیدا ہوتی ہیں۔ منفی خیالات زیادہ ہوں تو گھر میں لوبان کی دھونی مفید ہے۔ لوبان کی خوش بو سے شے میں yeast (خمیر) کم ہو جاتا ہے۔ لوبان ایک مہینہ رکھیں خراب نہیں ہوتا، آٹا خراب ہو جاتا ہے۔"

سائنس کے طالب علموں سے گزارش ہے کہ اقتباس اور خط کشیدہ جملے پر غور کریں اور اس حوالے سے تحقیق و تلاش ادارے کو ارسال کریں۔

### لوبان اور نو (9) کا ہندسہ

" مستقل ذہنی دباؤ، اعصابی کشاکش یا کسی اور وجہ سے اگر ذہن ماؤف رہتا ہو یعنی کوئی بات سمجھ میں نہ آتی ہو، دماغی یا جسمانی کام کرتے وقت ذہن ساتھ نہ دیتا ہو، ایسی صورت میں کالی روشنائی سے لوبان کے بہت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر نو (9) کے ہندسے لکھے جائیں اور لوبان کے ٹکڑوں کو دہکتے ہوئے کوئلوں پر ڈال کر دھونی کی طرح سلگائیں۔ یہ عمل ایسی جگہ کرنا چاہئے جہاں مریض کے علاوہ کوئی اور شخص نہ ہو۔ اس کے لئے رات کا وقت نہایت موزوں ہے۔ دھونی لینے کے بعد مراقبہ کریں یعنی آنکھیں بند کر کے اپنے دل میں دیکھیں۔ مراقبہ 15 منٹ سے آدھے گھنٹے تک کیا جائے۔ اس عمل سے انشاء اللہ ذہن میں ایسی روشنیاں منتقل ہونے لگتی ہیں جن سے مسائل کا حل آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے اور ذہن کے اندر حالات و مسائل کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔" (کتاب: روحانی علاج)

صائمہ مجید

# کفایت شعار بیوی
# فضول خرچ شوہر

ہم موکلانِ وظیفہ تم کو اطلاع دیتے ہیں کہ جس قدر رقم روزانہ درکار ہو، مقرر کر دو۔ تمہیں مقررہ رقم روزانہ تکیے کے نیچے رکھی ہوئی ملے گی۔

---

نعمان نجی ادارے میں ملازم تھا۔ تنخواہ اچھی تھی۔ آدھی تنخواہ گھر میں دیتا اور آدھی اپنے پاس رکھتا تھا۔ دو بچے تھے۔ خاندان مختصر تھا لہٰذا جو پیسے گھر میں دیتا اس سے خاطر خواہ گزارہ ہو جاتا اور جو رقم اپنے پاس رکھتا، کھلے ہاتھ سے خرچ کرتا تھا۔

صفیہ شوہر کی خوش اخلاقی اور محنت کی قائل تھی لیکن فضول خرچی اور ناعاقبت اندیشی سے نالاں تھی۔ نعمان کی خوش نصیبی تھی کہ بیگم کفایت شعار ملی ورنہ اس نے شاہ خرچی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ دراصل اٹھنا بیٹھنا جن لوگوں میں تھا ان میں نمود و نمائش تھی۔ نعمان نے آن بان شان قائم رکھنے کے لئے اسراف کا سہارا لیا۔

صفیہ کا تعلق با اخلاق گھرانے سے تھا۔ تربیت اچھی کی گئی تھی۔ ماں باپ کے اطوار سے گھر چلانا سیکھا۔ حسنِ صورت اور حسنِ سیرت کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے شوہر کو عزیز تھی۔ وہ فضول خرچ شوہر کو سمجھاتی تھی کہ فیشن کے غیر ضروری مصارف اور دوستوں کی بے جا مدارت میں محنت سے کمائی گئی آمدنی برباد نہ کرو لیکن کفایت شعاری کا لفظ نعمان کی لغت میں نہیں تھا۔

موصوف فرماتے تھے جس شخص کی آمد و خرچ برابر ہے وہی خوش حال اور کامیاب ہے۔

بیگم نے شوہر کو براہ راست نہیں ٹوکا کیوں کہ اکثر مرد و عورت کی عادت ہوتی ہے کہ انہیں روکا ٹوکا جائے تو ضد پر آجاتے ہیں۔ صفیہ ادھر ادھر کی باتوں میں یا کسی کی مثال دے کر اپنی بات کہہ دیتی تھی۔ شوہر پر بات کا وقتی اثر ہوتا جو گھر کی دہلیز سے قدم باہر رکھتے ہی ختم ہو جاتا تھا۔

صفیہ کہتی تھی کہ آمد و خرچ ہر موسم اور حالات میں یکساں ہوں تو بچت کیسے ہوگی۔ بیماری، بچوں کی ضروریات یا کوئی خرچہ آجائے تو خالی ہاتھ بیٹھ کر اگلی تنخواہ کا انتظار کرنا بے وقوفی ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ نعمان تنخواہ میں سے کچھ پیسے الگ رکھ کر اپنا کاروبار شروع کرے۔

نعمان کو تعجب تھا کہ ہر مہینے مقررہ رقم ملنے سے کیا پریشانی ہے۔ بیگم کا جواب ہوتا کہ تمہاری یہی سوچ میری پریشانی ہے۔ تم تنخواہ سے امید لگائے بیٹھے ہو اور ہر وقت افسر کی فکر ہوتی ہے کہ ناراض نہ ہو جائے۔ اپنے کاروبار سے ذہن اللہ کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ افسر تمہیں رزق نہیں دیتا۔ یاد رکھو کہ والدین کو جو رقم ملتی ہے اس میں اولاد کا حصہ ہے۔ ہم ان کی تربیت کے ذمہ دار ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ بچے باپ کا آئینہ بن جائیں۔

نعمان کے پاس بیگم کی مدلل گفتگو کا جواب اس کے سوا نہیں تھا کہ وہ گفتگو کا سلسلہ منقطع کر کے دوسری بات شروع کر دے۔

بیگم نے دیکھا کہ شوہر کی عادتوں کا بدلنا دشوار ہے تو فیصلہ کیا کہ اپنے تئیں جو ہو سکتا ہے، کر لوں۔ گھر کے خرچے کے لئے ملنے والے 40 ہزار میں سے کچھ رقم بچا کر رکھنی شروع کی۔ پھر ذاتی خرچ کے لئے جو رقم ملتی تھی، اسے بھی ایک طرف رکھ لیا۔ چند سالوں میں کفایت شعاری سے مناسب رقم جمع ہو گئی جس کی خبر شوہر کو نہ ہونے دی۔ اندیشہ تھا کہ نعمان صاحب بچت کی رقم سے کوئی نیا شوق پورا کریں گے یا درجن بھر سوٹ بنوائیں گے اور مہنگے پرفیوم خرید لیں گے۔

بہر حال اس طرح پانچ سال گزر گئے۔

ادارے میں نئے افسر نے نعمان کو کسی غلطی پر معطل کر دیا۔ ایسا شخص جس کی آمد و خرچ برابر ہو اور ملازمت سے معطل کر دیا جائے تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کا حال کیا ہو گا۔ معطلی کی مدت مقرر نہیں تھی۔ معاملہ دفتر کی لیگل کمیٹی کے سامنے پیش ہوا۔ نیا افسر ایک نہ ایک ایسا پہلو پیدا کر دیتا کہ معاملات آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے چلے جاتے۔

نعمان معطل ہونے پر بمشکل ایک ہفتہ مصارف کا انتظام کر سکا پھر قرض لینا پڑا۔ نئی ملازمت تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن بے روزگاری کا سلسلہ جاری رہا۔ چاہتا تھا کہ جب تک ملازمت بحال نہیں ہوتی، کہیں سے قرض مل جایا کرے۔

بیگم یہ حال دیکھ کر خاموش رہی اور سمجھ گئی کہ ابھی شوہر نے سبق نہیں سیکھا۔ بچت کی رقم ظاہر نہیں کی۔ وہ چاہتی تھی کہ شوہر کو ذمہ داری اور غفلت کا احساس ہو۔

نعمان نے ایک سہ ماہی قرض کی رقم بے فکری سے خرچ کی۔ دوسری سہ ماہی شروع ہوئی، نوکری بحال ہوئی نہ نئی نوکری ملی ـــــ قرض بڑھنے اور زمانے کا تازیانہ کھانے سے مزاج بحال ہونے لگے۔ شاہ خرچی موقوف ہوئی اور دال روٹی سے زندگی بسر ہونے لگی۔ الماری مہنگی خوش بوؤں اور کلف لگے کپڑوں سے بھری ہوئی تھی لیکن جیب

خالی تھی ـــــ دوستوں نے فون اٹھانا چھوڑ دیا۔ آمدنی کی کوئی صورت تھی نہ ملازمت کی بحالی کی امید۔ قرض کی رقم بھی ختم ہوگئی۔ گھر میں راشن تھا، فاقوں کی نوبت نہیں آئی تھی لیکن لگتا تھا کہ فاقوں کے دن اب دور نہیں۔

جب آدمی مادی دنیا کی تدابیر سے مایوس ہو جاتا ہے تو اللہ سے رجوع کر کے دربارِ الٰہی میں سربسجود ہو کر التجا پیش کرتا ہے۔ نعمان کی دل شکستگی اور مایوسی اس منزل پر پہنچ چکی تھی۔ جو نماز دو منٹ میں پڑھتا تھا اب خضوع و خشوع کے ساتھ 20 منٹ میں پوری ہوتی تھی۔ سجدے طویل ہو گئے۔ تلاوتِ قرآن اور وظائف میں دل لگنے لگا۔

پڑوسی نے کسی اللہ والے کے بارے میں بتایا۔ نعمان حاضر ہوا۔ بزرگ نے رزق میں برکت کا وظیفہ دیا اور کہا کہ معمولی کام بھی ملے تو انکار نہ کرنا، رفتہ رفتہ حالات اچھے ہو جائیں گے۔

وظیفہ سونے سے پہلے کرنا تھا۔ بیگم سے کہہ دیا کہ وظیفے کے بعد بات کئے بغیر سونا ہے اس لئے خیال رکھے کہ اس دوران کوئی مخل نہ ہو۔

وہ بالا خانے پر تنہائی میں وظیفہ پڑھتا اور شب کو وہیں سو جاتا۔ اس طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔

ایک صبح آنکھ کھلی تو بستر پر کاغذ رکھا ہوا ملا۔ تحریر سے نا آشنا تھا کیوں کہ ہر لفظ کے حروف جدا جدا لکھے تھے جن کو جوڑنے سے یہ عبارت بنی:

”ہم موکلانِ وظیفہ تم کو اطلاع دیتے ہیں کہ جس قدر رقم روزانہ درکار ہو، مقرر کر دو۔ تمہیں رقم روزانہ تکیے کے نیچے رکھی ہوئی ملے گی بشرطیکہ جب نوکری بحال ہو جائے تو اتنی ہی رقم روزانہ تکیے کے نیچے رکھ دینا۔ اگر اس کے خلاف عمل کیا تو دگنی رقم دینی ہوگی اور حال، موجودہ حال سے بدتر ہوگا۔ راز کو بھولے سے بھی زبان پر نہ لانا اور ملازمت کی تلاش جاری رکھنا۔“

تحریر پڑھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔

وظیفہ بزرگ نے بتایا تھا اس لئے رقعے والی بات ان سے نہیں چھپائی۔ حاضر ہو کر ماجرا بیان کیا۔ انہوں نے آنکھیں بند کیں اور تھوڑی دیر بعد مسکراتے ہوئے کھول دیں۔

فرمایا، موکل ٹھیک کہتے ہیں۔ صاحبِ وظیفہ کا یہی علاج ہے۔ وظیفے کے ساتھ کاغذ پر لکھا ہوا عمل جاری رکھو۔ اور ہاں! رقم اتنی مقرر کرنا جس میں فضول خرچی کا احتمال نہ ہو، ورنہ لینے سے زیادہ دینے پڑیں گے۔

اس نے دن کے پانچ سو روپے مقرر کئے اور یہ بھی گھر کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ سوچا کہ زیادہ کی طلب کی تو ملازمت بحال ہوتے ہی دگنی رقم واپس کرنی پڑے گی۔ جوابی رقعہ سرہانے رکھا:

”مجھے روزانہ پانچ سو روپے کی ضرورت ہے۔ ملازمت بحال ہوئی تو وعدے پر قائم رہوں گا۔“

اور وظیفہ پڑھ کر سو گیا۔

صبح بیدار ہوا تو حیرت کی انتہا نہ رہی کہ شب کو سرہانے رکھا ہوا رقعہ غائب تھا اور اس کی جگہ پانچ سو روپے کا نیا نوٹ تھا۔ بہت خوش ہوا۔

دل چاہا کہ بیگم اور دوستوں سے غیبی مدد کا ذکر کرے لیکن راز کو راز رکھنے کی سخت تاکید تھی۔ الغرض اب معمول تھا کہ صبح کو بیدار ہوتا تو تکیے کے نیچے پانچ سو روپے رکھے ہوتے۔

بات بیگم سے چھپائی تھی اس لئے گھر سے باہر جاتا اور شام کو واپس آکر نوٹ صفیہ کو تھما دیتا جیسے کما کر لایا ہو۔ ایک ہفتے بعد کہا کہ کوشش کرنا فضول خرچی نہ ہو۔ صفیہ مسکرا دی۔

نعمان فاقہ کشی کی مصیبت اور قرض داروں کے ہاتھوں رسوائی سے بچ گیا۔ اس نے وظیفہ جاری رکھا۔ اس دوران ٹیکسی چلانی شروع کی اور پانچ سو کے علاوہ روز کے تین چار سو روپے گھر میں دیتا۔ کمپنی میں ملازمت کا مقدمہ ابھی تک چل رہا تھا۔ اس حالت کو چھ ماہ گزر گئے۔ خیال آیا کہ مشکل دن ابھی باقی ہیں۔ مگر ساتھ ہی شکر ادا کیا کہ جو مل رہا ہے اللہ نے اس میں برکت رکھ دی ہے۔

اللہ نے فضل کیا اور جس افسر نے معمولی غلطی پر معطل کیا تھا اس کا تبادلہ ہو گیا۔ نیا افسر آیا۔ نعمان کا مقدمہ پیش ہوا۔ افسر نے ملازمت کا ریکارڈ دیکھتے ہوئے معمولی جرمانہ کر کے نوکری بحال کر دی۔ بحالی کا حکم سن کر نعمان کو جو مسرت حاصل ہوئی اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ان حالات سے گزرتے ہیں۔

شام کا وقت تھا جب نویدِ جاں فزا کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔ وفادار اور سلیقہ مند بیوی نے خوش بختی پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ نعمان نے اگلے روز سے دفتر جانا شروع کر دیا۔ ساتھیوں نے مبارک باد دی۔ وہ ان ساتھیوں سے بھی خوش دلی سے ملا جنہوں نے مصیبت میں اکیلا چھوڑ دیا تھا۔

جس دن نعمان کو تنخواہ ملی، اس صبح دستِ غیب کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔ اب ادائیگی کا وقت تھا۔

معمول بنالیا کہ رات کو سوتے وقت پانچ سو روپے تکیے کے نیچے رکھ دیتا۔ صبح اٹھتا تو روپے غائب ہوتے۔ پٹرول اور دیگر ضروریات کے خرچ کے لئے دس ہزار روپے پاس رکھے، باقی تنخواہ بیگم کے ہاتھ پر رکھ دی۔

جب کئی روز مسلسل شام کو بیگم سے پانچ سو روپے لئے تو اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا، کیا بات ہے، کوئی نیا شوق ڈھونڈ لیا ہے جس کے لئے بلاناغہ پانچ سو روپے لئے جاتے ہیں؟

اخفائے راز مقصود تھا، نعمان نے ایک لفظ نہیں

کہا اور ہنستے ہوئے بات ٹال دی۔

سخت حالات سے گزرنے سے فائدہ یہ ہوا کہ جس انقلاب کی بیگم کو شوہر سے توقع تھی، مشکل حالات سے گزر کر وہ تاثیر پیدا ہوگئی۔ ڈیڑھ سال کی معطلی نے ایسا سبق دیا کہ وہ با اصول اور کفایت شعار بن گیا۔ ادائیگی کی مدت، امداد کی مدت کے برابر تھی۔ معمول جاری رکھا۔

ایک شب عجیب معاملہ پیش آیا۔ آنکھیں بند تھیں لیکن نعمان جاگ رہا تھا۔ کوئی دبے قدموں کمرے میں داخل ہوا، بستر کے قریب آکر تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا اور باہر نکال لیا۔

ہر فرد کی مخصوص خوش بو اور آہٹ ہوتی ہے۔ معلوم ہوگیا کہ کون ہے لیکن وہ خاموش رہا اور بات کو مخفی رکھا۔ صبح جاگا تو حسبِ معمول تکیے کے نیچے پیسے نہیں تھے۔ اگلے روز سونے کی اداکاری کی۔ رات گہری ہوئی تو تکیے کے نیچے ہاتھ محسوس ہوا۔ گزشتہ روز کی طرح آج بھی کسی نے پیسے نکال لئے۔ نعمان خاموش رہا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ پیسے نکالنے والے کا وقت مخصوص نہیں تھا۔

تیسرے روز رات بھر بیدار رہا لیکن کسی نے پیسے نہیں نکالے۔ صبح صادق سے پہلے تکیے کے نیچے ہاتھ آیا—اس نے ہاتھ پکڑ لیا۔

عجب وقت تھا کہ سربستہ راز فاش ہوا تھا۔

پیسے نکالنے والا کوئی اور نہیں، صفیہ تھی۔

صفیہ کا چہرہ سفید ہوگیا۔ شوہر کے چہرے پر کئی سوالات تھے۔ گزشتہ ڈیڑھ سال کی فلم آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔

۱۔ رقعہ کس نے رکھا تھا؟

۲۔ کیا وہ موکل نہیں تھے؟

۳۔ یہ سب میری بیوی نے کیا؟

۴۔ اس کے پاس پیسے کہاں سے آئے؟

۵۔ کیا بزرگ اس بات سے واقف تھے اس لئے انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ یہی علاج ہے؟

راز کھل چکا تھا اس لئے بیوی نے سارا قصہ بیان کیا اور بتایا کہ آپ کو سدھارنے کا میرے پاس کوئی حل نہیں تھا۔ جب وظیفہ پڑھتے دیکھا تو ترکیب سوجھی اور میں نے خط بگاڑ کر رقعہ لکھا۔ جو پیسے جمع کئے تھے، روز تکیے کے نیچے رکھتی۔ جب ادائیگی کا وقت آیا تو یہی پیسے واپس جمع کرنا شروع کر دیئے۔

نعمان نے شکوہ کیا کہ اگر تم پہلے مدد کر دیتیں تو قرض نہ لینا پڑتا۔ صفیہ نے کہا، آپ ان حالات سے نہ گزرتے تو اچھے برے کی پہچان کیسے ہوتی؟

نعمان نے اعتراف کیا کہ تمہاری سلیقہ شعاری اور دانش مندی مجھے راہِ راست پر لے آئی ہے۔ میں خوش ہوں کہ تباہی سے بچالیا۔

محمد عدنان خان

# پورب کے ہم زاد

رنگ و چمن، عروج و زوال، عشق و مستی اور فنا و بقا کے رنگوں سے معمور صدیوں پر محیط داستان جس کی مکانیت تبت کی فلک بوس چوٹیوں سے لے کر ٹیکسلا کی سرسبز وادیوں تک پھیلی ہوئی ہے۔

ردا کا میلان ماورائی علوم کی طرف تھا۔ اس نے پی ایچ ڈی مکمل کرنے کے لئے ٹیکسلا کے آثارِ قدیمہ کا انتخاب کیا جہاں صدیوں پرانی داستان صفحۂ قرطاس پر ظاہر ہونے کی منتظر تھی۔ ٹیکسلا میں صدیوں پرانے کشان دورِ حکومت کا شہزادہ ملا جو اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ ردا کو شہزادے سے دور رکھنے کے لئے مکروہ صورت بوڑھا بجر ولال سامنے آیا اور ردا کی پریشانیوں کا آغاز ہوا۔ نیلم کے توسط ردا کی بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ شہزادے اور اس کے ساتھیوں کے ہم زاد کو شیطانی چیلوں سے آزاد کروانے کے لئے تمہارا انتخاب ہوا ہے۔ ردا ملاقات کے بعد گھر جا رہی تھی کہ راستے میں حادثہ پیش آیا۔ نیلم کو کم چوٹیں آئیں لیکن ردا کوما میں چلی گئی۔ اسپتال میں اس کے اندر سے روشنی کا پرت نکلا اور ماضی میں سفر کرتے ہوئے ہزاروں سال پہلے کے تبت میں لے گیا۔ یہاں ایک پہاڑ پر بنی عبادت گاہ مسکن قرار پائی۔ ردا سے پہلے عبادت گاہ میں بزرگ خاتون رہتی تھیں جو شہزادے کے علاج کے لئے محل گئی ہوئی تھیں۔ علاقے میں شیطانی قوتوں کو ردا کی آمد کا علم ہوا تو انہوں نے مشکلات کھڑی کیں لیکن قدرت ردا کی حفاظت کر رہی تھی۔ شہزادہ صحت یاب ہوا اور بزرگ ماں محل سے لوٹ آئیں۔ شہزادہ ان کی تلاش میں پہاڑ کی چوٹی پر بنی عبادت گاہ پہنچا۔۔۔ وہ وہاں سے جا چکی تھیں۔

---

رتن ناتھ کے ہاتھ پر گہرا زخم تھا۔

اف! یہ کیسے ہوا اور مہتر کون ہے۔۔۔؟

بی بی جی! دندان نے کئی مرتبہ آپ کا کام کرنے سے منع کیا ہے۔ میرا بھائی شاہی اصطبل میں نوکر ہے، اس کے ذریعے پیغام بھجوایا کہ اب رتن ناتھ نے عبادت گاہ کا رخ کیا تو بھیانک سزا ملے گی۔ اگلے روز آپ کو سامان دے کر واپس گیا تو گھر میں مہتر کو دیکھا۔ وہ ہمارے سوا کسی کو دکھائی نہیں دیتا اور ہمیں بھی ہر وقت نظر نہیں آتا۔ اس نے ایسے زخم سب گھر والوں کو لگائے ہیں۔ بی بی جی! جب میں چھوٹا تھا تو مہتر گاؤں کی صفائی کرتا تھا۔ پھر اچانک غائب ہو گیا۔ سنا تھا کہ مر گیا ہے۔ اب

نجانے کہاں سے بھوت بن کر واپس آ گیا۔ بازو میں جھاڑو دبی ہوتی ہے اور ہاتھ میں کٹاری (چھوٹا خنجر) ہوتی ہے جس سے وہ دھمکاتا اور زخمی کرتا ہے۔ میں خوف سے کسی کو بتا نہیں سکا مگر اب حد ہو گئی ہے۔ آج میری بچی کے ہاتھ پر ایسے دو نشان ہیں۔

صورت حال تشویش ناک تھی۔ ایک امتحان سے نکل کر میرے لئے دوسرا امتحان تیار تھا جس میں شامل ہوئے بنا مجھے اس سے بچ کر نکلنا تھا اور رتن ناتھ کے گھر والوں کو بھی بچانا تھا۔ یک دم ذہن میں جھماکا ہوا اور بڑھیا کا معمّا حل ہو گیا۔ یہ کام دندان کی ماں لچھاوی کا ہے۔ عبادت گاہ سے براہِ راست منسلک فرد پر سفلی عمل کا حملہ کرنے کی جرأت لچھاوی کے سوا کسی کی نہیں تھی۔ سحرِ سفلی کا ایک شعبہ ایسا ہے جس میں زندہ یا مردہ شخص کے ہم زاد کو قابو کر کے مذموم مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

کچھ دیر آنکھیں بند کیں تو دیکھا کہ مہتر برسوں پہلے مر چکا تھا اور دندان نے اس کے ہم زاد کو معمول بنا لیا ہے۔ سفلی عمل کرنے والوں کو ایسے لوگوں کے ہم زاد قید کرنا آسان ہے جن کے ذہن میں شک ہے اور جو وسوسوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ کم زور یقین کے حامل شخص کو آسانی سے قابو کیا جاسکتا ہے۔ اور جن کا اللہ پر یقین محکم ہے، وہ سفلی عمل کا اثر قبول نہیں کرتے۔ مہتر وسوسوں میں مبتلا شخص تھا اس لئے دندان نے اس کے ہم زاد کو قابو کر لیا۔

میں نے کہا، جن لوگوں کا وقت اس عالم میں پورا ہو جائے، وہ اعراف میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ یہاں سے جانے والوں میں سے وہ لوگ جو وسوسے، شکوک و شبہات، انتشار، پریشانی اور خوف و غم میں مبتلا رہتے ہیں، ان کے ہم زاد مرنے کے بعد مسائل کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اول تو جو شخص حالتِ غم میں مرتا ہے وہ اسی حالت میں اعراف میں داخل ہوتا ہے اور دیکھا جائے تو یہ فرد کا خود پر مسلط کیا ہوا عذاب ہے۔ دوم یہ کہ ایسے لوگ شیطان اور اس کے پجاریوں کے نشانے پر ہوتے ہیں۔ شیطان ان کے دماغ میں وسوسے ڈالتا ہے، شک پیدا کرتا ہے، یقین کی قوت کم زور کرتا ہے اور چھوٹے سے چھوٹا کام بھی کرنا چاہیں تو شک میں مبتلا رکھتا ہے کہ ناکامی ہوئی تو کیا ہو گا۔ دوسروں پر توکیا، ان کا خود پر سے یقین اٹھ جاتا ہے۔ سب شیطانی وسوسوں کا شاخسانہ ہے۔

رتن ناتھ، بھرگوی اور آیوشی توجہ سے سن رہے تھے اور میرے دماغ میں حضرت علامہ اقبالؒ کے شعر کی تکرار جاری تھی۔

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مَردوں کی شمشیریں

میرے خاموش ہونے پر بھرگوی جو کم گو تھی،

سنسکرت میں بولی، (ترجمہ) بی بی جی! وسوسوں سے بچنے کا طریقہ بھی بتائیں۔

میں نے رسان سے کہا، نہ برا سوچو، نہ برا سمجھو اور نہ برا کرو۔ یہ بات ذہن نشین کرلو کہ آدمی حالات کے ہاتھوں میں کھلونا ہے۔ جو ہو رہا ہے، اس پر اختیار نہیں۔ پھر پریشان ہونے کا کیا فائدہ؟ اللہ پر توکل کے ساتھ حالات میں بہتری کی کوشش کا حکم دیا گیا ہے۔ نتیجہ اللہ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں۔ اور ہاں! رتن ناتھ جو تعویذ میں نے دیئے ہیں، ان میں ایک اضافی ہے۔ گھر کا کوئی فرد باہر جائے تو گلے میں پہن لے۔

رتن ناتھ نے اثبات میں سر ہلایا اور جانے کی اجازت چاہی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ جلد از جلد گھر پہنچے تاکہ اس کا یرغمالی خاندان سکھ کا سانس لے۔

---

عبادت گاہ اور اس سے منسلک لوگ براہِ راست لچھاوی اور دندان کے نشانے پر تھے۔ استدراجی حملوں میں بار بار ناکامی نے انہیں مشتعل کر دیا تھا۔ بادشاہ کنڈل کڈفیزز اور شہزادہ جے ونت لچھاوی کے کرتوتوں سے ناواقف تھے جب کہ لچھاوی کا خاندان صدیوں سے شیطان کی نوازشات کے ساتھ روئے زمین پر بوجھ بنا ہوا تھا۔ مخلوقِ خدا کو ایذا پہنچانے سے انہیں رغبت تھی۔ نیک باطن لوگ ان کا خاص ہدف تھے۔ بزرگ خاتون اپنی پیدائش سے لے کر آج تک ان کا نشانہ بنی ہوئی تھیں مگر آفرین ہے ان کے صبر پر کہ پلٹ کر وار نہیں کیا۔ ہمیشہ نظر انداز کیا۔ نیکوکار لوگوں کا زادِ راہ صبر ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

"اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

اب یہ بات کتنی آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہے کہ اللہ کو بے صبری پسند نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر اللہ بے صبر لوگوں کے ساتھ نہیں ہے تو پھر کون ان کے ساتھ ہے؟

---

رتن ناتھ آزمائش سے دو چار تھا۔ وہ صبر کا دامن تھامے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں بھی کمرے میں آگئی۔ دل بوجھل تھا اور طبیعت حیران تھی۔ ایسے شیطانی طرز فکر کے حامل لوگوں سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اچانک مجھے بوڑھا بجرو لال یاد آگیا جس کی وجہ سے حادثے کا شکار ہو کر میں یہاں پہنچی تھی اور میرا جسم ابھی تک اسپتال میں کومے کی حالت میں تھا۔ یہ سب ایک قبیل کے لوگ تھے۔

لچھاوی کی پریشانی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اب اس کے راستے میں ایک کے بجائے دو رکاوٹیں تھیں۔ بزرگ خاتون اور میں۔ بزرگ خاتون حسین اور جوان تھیں۔ علم و حکمت، خدمتِ خلق اور روحانی مراتب کی وجہ سے علاقے میں بزرگ خاتون کے

نام سے مشہور تھیں۔

لچھاوی کو بزرگ خاتون کے معاملے میں ہمیشہ منہ کی کھانی پڑی —— میں بھی اس کے لئے آسان ہدف ثابت نہیں ہوئی۔ بزرگ خاتون کی جگہ میرا عبادت گاہ میں آنا اس کے لئے اچھنبے کا باعث تھا کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آئی ہوں۔

میرا ذہن لچھاوی کے خاندان میں اٹک گیا۔ کیسے درندہ صفت اور موذی طرز فکر کے حامل افراد کا ٹولہ تھا۔ توجہ دندان کے سیدھے ہاتھ کی طرف گئی جو قدرے بڑا اور سیاہی مائل تھا۔ جب سلابھا کی ماں موریا کو دندان کی قید سے چھڑا کر لاتے ہوئے دندان نے مجھ پر تلوار سے حملہ کیا تھا تو ہاتھ کے نقوش ذہن میں نقش ہو گئے تھے۔

اچانک دماغ میں سفید روشنی کے جھماکے ہونے لگے۔ وجود پر لاشعوری کیفیات کا غلبہ بڑھا پھر ایک اور جھماکے سے جسم کو زوردار جھٹکا لگا اور شعوری حواس کا غلبہ ہو گیا۔ شعوری اور لاشعوری کیفیات کے غالب مغلوب ہونے کے ساتھ میں لڑکھڑاتے قدموں سے بستر تک پہنچی۔ آیوشی گھبراہٹ میں کبھی دائیں طرف سے سہارا دیتی اور کبھی بائیں طرف سے۔ اس کے چھونے سے شدید الجھن ہو رہی تھی مگر خلوص سے صرفِ نظر کیسے کرتی۔

جیسے ہی لاشعوری کیفیت کا غلبہ ہوتا، کوئی نہ کوئی منظر ذہن میں روشن ہو جاتا۔ مناظر کی تبدیلی کیفیات کی تبدیلی سے جڑی ہوئی تھی۔

میں نے دیکھا —— بزرگ خاتون برفانی گھاٹی سے گزر رہی ہیں۔ اگلے لمحے دندان سے لڑائی کا منظر اور اس کا سیدھا ہاتھ دکھائی دیا۔ پھر دیکھا کہ رتن ناتھ پہاڑ سے اتر رہا ہے۔ اس کے بعد دماغ کی اسکرین پر وہ منظر ابھرا جسے دیکھ کر مجھے جھرجھری آگئی۔ میری دوست نیلم گاڑی چلا رہی تھی کہ پُل پر چڑھنے سے پہلے وحشت ناک بوڑھا بجر ولال جو گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا، ہماری طرف جھکا اور سیدھا ہاتھ پوری قوت سے پچھلے ٹائر پر مارا۔ غیر معمولی ہاتھ کا عکس ذہن کی اسکرین پر نقش ہو گیا۔ ساتھ ہی زوردار دھماکے سے ٹائر پھٹا۔ خوف سے میری چیخ نکل گئی۔

آیوشی میری چیخ سے سہم گئی۔ بستر نزدیک تھا، میں ہمت کر کے بستر پر پہنچی اور ڈھے گئی۔

آیوشی کو باہر جانے کا اشارہ کیا تو میری حالت کے پیش نظر وہ جھجک گئی کہ مجھے چھوڑ کر کیسے جائے۔ دوبارہ اشارہ کرنے پر وہ تیزی سے کمرے سے باہر چلی گئی۔

میں تھی اور بدلتی ہوئی کیفیات۔

بجر ولال اور دندان کے ہاتھ میں اتنی مماثلت تھی کہ ایک ہونے کا گمان ہوا۔ ذہن ماضی میں ہونے والے حادثے کی طرف گیا تو گھر بار والد،

والدہ اور بہن کے نقوش ذہن کی سطح پر ابھر کر معدوم ہو گئے۔ کچھ دکھائی نہ دیا۔ سب کچھ بھول کے خانے میں بند ہو گیا جیسے بچپن کی اکثر باتیں بھول کے خانے میں چلی جاتی ہیں۔

خیال کی لہر ذہن کو ماضی کی بھول بھلیّوں سے کھینچ کر رتن ناتھ کے گھر لے گئی۔ وہ گھر کے داخلی دروازے کی چوبی چوکھٹ کے اوپر لگے ڈنڈے پر تعویذ چسپاں کر رہا تھا جب کہ مہتر گھر سے باہر بغل میں تنکوں والی جھاڑو دبائے غضب ناک نظروں سے گھور رہا تھا۔ پھر رتن ناتھ گھر کے اندر چلا گیا۔ میری نگاہ کا ہدف وہ تعویذ تھا جو اس نے چوکھٹ پر لگایا تھا۔ تعویذ لگانے کا اثر واضح تھا۔

مہتر کو گھر سے نکلنا پڑا مگر خطرہ ٹلا نہیں تھا، وہ باہر موجود، واپس اندر جانے کا منتظر تھا۔ جیسے کسی نے اسے یہاں سے جانے سے روکا ہو۔

میری نگاہیں تعویذ پر مرکوز تھیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس پر خون کی چھوٹی چھوٹی بوندیں نمودار ہوئیں جیسے ٹھنڈے پانی کے گلاس کی بیرونی سطح پر پانی کی بوندیں نمودار ہوتی ہیں۔ پھر تعویذ (نقش) کی سیاہی خون میں حل ہونے لگی اور چند منٹوں میں خون اور سیاہی کا محلول بوندوں کی صورت ٹپکنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ سیاہی مائل غیر معمولی ہاتھ میری آنکھوں کے سامنے آگیا اور سماعت میں لچھاوی کے قہقہے داخل ہوئے۔

میں جو بستر پر بے سدھ پڑی، ماضی اور حال سے جڑے مناظر میں کھوئی ہوئی تھی، ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی۔ غصے کی لہر اٹھی۔ رتن ناتھ کا چہرہ نظروں میں گھوم گیا۔ اسے سخت خطرہ لاحق تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس معاملے سے کیسے نمٹوں۔

میں سمجھتی تھی کہ غصے نے میرے وجود کو چھوڑ دیا ہے اور اب کسی بات پر غصہ نہیں آتا۔ ثابت ہوا کہ یہ میری خام خیالی تھی۔

بابا کے الفاظ ذہن میں گونجے:

”اللہ اور بندے کے بیچ تین پردے ہیں۔

۱۔ میں یعنی انا کا پردہ

۲۔ غصے کا پردہ

۳۔ جنس کا غلبہ

جب تک بندہ ان تین جبلی عادتوں پر قابو نہیں پاتا معرفت نہیں ملتی۔“

سر پر غصہ ایسا سوار ہوا کہ لچھاوی اور دندان سامنے ہوتے تو انہیں پیوندِ خاک بنانے میں کسر نہ چھوڑتی۔ جسم پر چیونٹیوں کا رینگنا اور کانوں میں سائیں سائیں محسوس ہوئی۔ اس سے پہلے کہ غضب میں غلط قدم اٹھاتی، کانوں میں بزرگ خاتون کی شفیق آواز میں تنبیہ گونجی:

”ہے بی بی! کیا جسم کیڑوں کو کھلانا ہے—؟ غصہ تو جسم کو سڑا دیتا ہے رے۔ وہ تمہیں غصہ

دلا کر کھیلنا چاہتی ہے۔ ہوش میں آؤ بی بی! تم پر بڑی ذمہ داری ہے۔"

آواز نے جھنجوڑ دیا۔ فوراً استغفار کر کے دماغ کو ٹھنڈا کیا۔ نظر عصا پر گئی تو نئی مصیبت سامنے تھی۔ سانپ سرپ پندورا عصا سے غائب تھا اور ماحول میں سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ دائیں بائیں تلاش کیا کہ آیوشی اور بھرگوی ہانپتے کانپتے اندر آئیں۔

حسب معمول آیوشی پھولی ہوئی سانسوں سے بولی، بی بی جی! کوئی صاحب ملنے آئے ہیں۔ ان کی شکل کے کئی لوگ ان کے ساتھ ہیں۔

کون ہیں، تعارف نہیں کروایا؟

بی بی جی! ہم انہیں دیکھ کر ڈر گئے اور سیدھا آپ کے کمرے میں آ گئے۔

مجھے ابرو کے درمیان تل کے ابھار میں حرارت محسوس ہوئی۔ اس مقام پر سمندری سانپ کے سر کا پتھر تھا جو شاہ سرپ پدم ناگ، سرپ ککولا نے تحفے میں دیا تھا۔ ہاتھ بے اختیار ان کے دیئے ہوئے دوسرے تحفے یعنی منکے کی طرف گیا۔ منکا کلائی پر موجود تھا۔

آیوشی حیرت سے میری پیشانی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ غالباً کچھ محسوس کیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، میں نے کہا، مہمانوں کو اندر بھیج دو۔

سرپ پندورا کا عصا سے غائب ہونا معنی خیز تھا۔ نہ جانے کہاں نکل گیا۔ یقیناً غائب ہونے کی معقول وجہ تھی۔ میں نے آنے والے غیر معمولی ملاقاتی سے ملنے کے لئے خود کو تیار کیا۔ عصا میرے ہاتھ میں تھا۔ پھر مہمان اندر داخل ہوا اور ماحول پر چھائی سنسنی کی وجہ سامنے آ گئی۔

میرے سامنے شاہ سرپ (سانپوں کا بادشاہ) دروازے پر کھڑا، اندر آنے کی اجازت کا منتظر تھا۔ اجازت پر وہ نپے تلے قدموں کے ساتھ اندر آیا۔ ساتھ آنے والے چھ ہم شکل اس کے پیچھے قطار میں چلتے ہوئے پرچھائیوں کی صورت میں اس کے وجود میں سماتے گئے۔ آیوشی اور بھرگوی خوف زدہ باہر کھڑی اندر کا منظر دیکھ رہی تھیں۔

سرپ ککولا میرے روبرو پہنچ کر کورنش بجالایا۔

آداب و تسلیمات کے بعد باوقار انداز سے بولا، بی بی جی! آپ کے آرام میں مخل ہوا، معذرت چاہتا ہوں لیکن بات ہی کچھ ایسی ہے کہ آپ کو مطلع کرنا ضروری ہے۔

میرے اشارہ کرنے پر آیوشی اندر آئی اور جلدی سے بیٹھنے کے لئے مونڈھا رکھ کر باہر جانے لگی۔ اسے شاہ سرپ کی مہمان نوازی کے لئے بکری کا دودھ پیش کرنے کو کہا۔ پھر شاہ سرپ سے مخاطب ہو کر بولی، جی کہئے، میں سن رہی ہوں۔

(قسط:۱۶)

ادارہ

# اولی الالباب بچے

اللہ تعالیٰ چھپا ہوا خزانہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ مخلوق مجھے پہچانے تو محبت سے مخلوق کو تخلیق کیا اور کائنات بنائی۔ کائنات اور جو کچھ اس میں ہے وہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے واقف ہونے کی نشانیاں ہیں۔ جو چھوٹے اور بڑے بچے غور و فکر کرتے ہیں وہ اولی الالباب (عقل و دانش والے) کہلاتے ہیں۔ بچو! ذہن استعمال کیجئے، سوچئے اور جو جواب ذہن میں آئے، لکھ کر بھیج دیجئے۔ ہمارا پتہ ہے: بچوں کا قلندر شعور، عظیمی محلّہ، سرجانی ٹاؤن، کراچی۔

---

غور و فکر کرنے والے ہونہار بچو، آپ پر اللہ کی سلامتی ہو۔

اللہ نے کُن فرمایا تو کائنات اور اس کی ہر شے وجود میں آگئی۔ یعنی ہر شے آواز کی وجہ سے قائم ہے۔ بزرگ فرماتے ہیں کہ کُن کی گونج آج بھی جاری ہے اور سننے والے سنتے ہیں۔

1۔ آپ بیٹھے ہوئے ہیں تو پیٹ کے بل زمین پر لیٹ جایئے۔ سر دائیں طرف اس طرح رکھئے کہ ایک کان زمین پر ہو۔ زمین آپ سے باتیں کرتی ہے۔ غور سے سنئے وہ کیا کہتی ہے۔

2۔ کہتے ہیں کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ جب کان ہوتے ہیں تو آنکھ، ناک اور زبان بھی ہوگی۔ دیوار سے کان لگایئے اور بتایئے، دیوار ہم سے کیا کہہ رہی ہے۔

3۔ پانی کا بڑا گلاس لیجئے اور کانوں سے لگایئے۔ گلاس میں گونج ہوگی۔ بتایئے، اس گونج کا مطلب کیا ہے؟

4۔ ایک ہاتھ سے مٹھی بنایئے اس طرح کہ ایک طرف سے مٹھی بند اور دوسری طرف سے کھلی ہو۔ جو حصہ کھلا ہو، کان کے قریب کرکے سنئے کہ آواز کس کی ہے؟ کیا وہ ہم سے کچھ کہہ رہی ہے؟

بتایئے زمین، دیوار، گلاس اور آپ کے ہاتھ سے آنے والی آواز کیا ہے، کس کی ہے، کیوں آتی ہے اور کیا کہتی ہے؟

*** جواب بھیجنے کی آخری تاریخ 20 نومبر ہے۔**

**س: ستمبر 2020ء میں سوال کیا گیا تھا کہ 0 اور 1 میں سے کس کی اہمیت ہے اور یہ کون سا حساب ہے؟**

- **مریم نیاز، جماعت پنجم (پشاور):** اہمیت دونوں کی ہے لیکن 0 کی اہمیت زیادہ ہے۔ جتنے 0 ہم 1 کے آگے لگائیں گے، 1 کی ویلیو اتنی زیادہ ہوگی۔ 1 کی جگہ 6 بھی لگایا جاسکتا ہے لیکن صفر کی جگہ ہم کسی نمبر کو استعمال نہیں کرسکتے۔ جس کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا، وہ اہم ہے۔
- **بلال (بریڈفورڈ):** یہ حساب illusion کا ہے۔ صرف 0 موجود ہے، 1 تبدیل ہوتا رہتا ہے۔
- **اریبہ، جماعت دہم (فیصل آباد):** آج سو روپے پرانے زمانے میں 1 روپے تھے۔ وقت کے ساتھ 1 روپے کی اہمیت بدلتی رہی لیکن 0 تبدیل نہیں ہوا۔ 0 (صفر)، 1 کو دس گنا بڑھا دیتا ہے۔
- **ریان:** دونوں اہم ہیں۔ 0 سے پہلے کچھ نہیں ہوگا تو 0 رہے گا، 1 کے بعد کچھ نہیں ہوگا تو 1 رہے گا۔
- **ایمان، دمن، حور (پشاور):** باباجی فرماتے ہیں کہ ابتدا، انتہا، ظاہر، باطن جب ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو خلا "◯" بنتا ہے، یعنی دائرہ تخلیق ہوجاتا ہے۔ اگر ہم دائرے کو درمیان میں سے کاٹیں تو ہمارے پاس مثلث* بن جاتا ہے۔ مثلث تخلیقات ہیں اور 0 کا مطلب محیط ہونا ہے۔ اہمیت 0 کو حاصل ہے۔
- **احمد محی الدین، جماعت ہشتم (چشمہ):** موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اللہ نے میرے ذہن میں یہ بات ڈالی ہے کہ جس طرح موٹر سائیکل کے دو پہیّے ہوتے ہیں، اسی طرح ہماری اصل گاڑی کے بھی دو پہیّے ہیں یعنی شعور اور لاشعور۔ شعور کی علامت 1 اور لاشعور کی 0 ہے۔ لاشعور کی وجہ سے شعور نشوونما پاتا ہے۔ جب شعور (1) کو لاشعور (0) سے ملائیں گے تو شعور 1 سے 10، 10 سے 100 ہوجائے گا۔
- **رستم زمان (ٹورنٹو):** 0 کی ویلیو کا آج تک اندازہ نہیں لگایا جاسکا لیکن یہ جس کے ساتھ لگتا ہے اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ یعنی صفر انمول ہے جو دوسروں کے مول بڑھاتا ہے۔ اس لئے اہمیت صفر کی ہے۔
- **زنیرہ، جماعت ہفتم (کراچی):** صفر بنیاد ہے۔ گنتی 1 کے بجائے 0 سے شروع کرنی چاہئے۔

**خط بھیجنے والے دیگر بچوں کے نام:** عبداللہ نیاز (ٹورنٹو)، منتہیٰ مفیض (کراچی)، احسن، فیضہ سرور، عبداللہ انجم، عارف مقصود، عبدالرحمن انجم (فیصل آباد)، جویریہ جلیل (یو اے ای)، محمد فیضان (اسلام آباد)۔

* مثلث △

# نوفٹ کا ببر شیر

میرا نام لیف روگرس ہے۔ میں جنوبی اوٹاوا میں جانوروں کا شکار کرتا تھا۔ پہاڑی علاقے کے قریب رہتا تھا کیوں کہ وہاں ریچھ، ہرن، ببر شیر اور دیگر جانور کثیر تعداد میں تھے۔

یہ جس زمانے کی بات ہے ان دنوں میرے چند ساتھی شکار کے ارادے سے آئے۔ قیام میرے مکان میں تھا۔ شکاریوں کی تعداد بڑھنے سے شکار ملنا مشکل ہو گیا۔

ایک روز میں نے رائفل اٹھائی اور ہرن کے شکار کے لئے جنگل کا رخ کیا۔ عصر کا وقت تھا۔ قریب دور ہر جگہ دیکھ لی لیکن ہرن نظر نہیں آیا۔ ایک جگہ ہرن کے قدموں کے نشانات ملے تو امید بندھی — لگن اور حوصلے سے آگے بڑھا کہ ہرن اب ملا، تب ملا۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ اندھیرا پھیلنے کی وجہ سے قدموں کے نشانات دیکھنا مشکل تھا۔ چلتے چلتے دور نکل گیا۔ دل میں ڈر یا خوف نہیں تھا۔ علاقہ دیکھا بھالا تھا۔ یہاں کے چپے چپے سے واقف تھا۔ جانتا تھا کہ کن راستوں پر سفر کرنا ہے اور کون سا راستہ میرے مکان تک پہنچتا ہے۔

سورج غروب ہوتے ہی اندھیرا چھا گیا — ایسا اندھیرا کہ چند فٹ کے فاصلے کے بعد سجھائی نہیں دیا کہ آگے کیا ہے۔ ایسے میں کوئی شکار سامنے آجاتا تو نشانہ لینا ممکن نہیں تھا لہٰذا شکار کا ارادہ ترک کر کے رہائش گاہ کا رخ کیا۔

فضا خاموش اور ہوا ٹھہری ہوئی تھی۔ چند منٹ بعد اپنے پیچھے سرسراہٹ سنائی دی جیسے کوئی پیچھا کر رہا ہو۔ میں پریشان ہو گیا۔

مڑ کر دیکھا — کوئی نہیں تھا۔

چاند کی چودھویں تاریخ تھی۔ چاند کی مدھم روشنی نے تاریکی کو کم کر دیا تھا۔ اب میں بآسانی دور تک دیکھ سکتا تھا — لیکن کہیں کوئی پتّا ہلتا ہوا نظر نہیں آیا اور نہ آہٹ محسوس ہوئی۔

دل کو تسلی دی کہ خطرے کی بات نہیں لیکن انجانا خوف طاری تھا۔ دل خبردار کر رہا تھا کہ آس پاس کوئی موجود ہے جو مجھے نظر نہیں آرہا۔

دوبارہ چلنا شروع کیا۔ چلتے چلتے کھلے میدان میں آگیا۔ آگے بڑھنے سے پہلے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ شاید صورت حال واضح ہو جائے۔

پیچھے دیکھا تو پہلے پہل کچھ نظر نہیں آیا پھر سرسراہٹ ہوئی اور سانس حلق میں اٹک گیا۔ ایک بڑے ببر شیر نے جھاڑیوں میں سے سر باہر نکالا اور مجھے دیکھتے ہی فوراً کتّے کی طرح پیروں کے بل لمبا بیٹھ گیا۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنا بڑا شیر نہیں دیکھا تھا۔ چاند کی روشنی میں اس کا جسم سائے کی طرح نظر آیا۔ آنکھیں ایسی تھیں جیسے دہکتے ہوئے انگارے۔ آنکھوں میں چمک دیکھ کر ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑ گئی۔

جانتا تھا کہ پہاڑی ببر شیر اکثر اکیلے آدمی کا میلوں میل پیچھا کرتے ہیں لیکن فطری جھجک کی وجہ سے زیادہ قریب آتے ہیں نہ حملہ کرتے ہیں۔ اگر شیر بھوکا یا زخمی ہو تو الگ بات ہے۔ ایسی حالت میں وہ لحاظ نہیں کرتا اور لمحوں میں وہ کر گزرتا ہے جس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

نظر ببر شیر پر تھی۔ اندھیرے اور فاصلے کی وجہ سے اس کا جسم واضح نہیں تھا۔ وہ دائیں بائیں دم ہلا رہا تھا—یہ خطرے کی علامت تھی۔

میں نے گولی چلانے کے ارادے سے رائفل سیدھی کی۔ چاند کی روشنی میں نشانہ لینے کی کوشش کی لیکن منظر واضح نہ ہونے کی وجہ سے جتنی جلدی فائر کرنے کا فیصلہ کیا تھا، اسی تیزی سے ارادہ بدل دیا۔ نشانہ چوکنے کے امکانات زیادہ تھے۔ سوچا کہ گولی لگنے سے اگر ببر شیر کا کام تمام نہیں ہوا تو زخمی ببر شیر زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ دوسری صورت میں اگر میں کچھ نہ کروں تو ممکن ہے وہ میرا پیچھا کرتے ہوئے تھک کر واپس چلا جائے گا۔

پھر میں نے سوچا کہ ببر شیر کو میلوں اپنے پیچھے لگائے رکھنے کے بجائے کیوں نہ خوف زدہ کر کے بھگا دوں۔ یہ سوچ کر سر سے ٹوپی اتاری اور دوسرے ہاتھ میں رائفل پکڑ کر دونوں ہاتھوں کو بلند کر کے چیختا ہوا شیر کی جانب دوڑا۔ اس حرکت کا ردعمل صرف اتنا ہوا کہ ببر شیر نے جو اب تک سر پنجوں پر رکھے بیٹھا تھا—یک دم سر اٹھایا۔ اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں دور سے نظر آرہی تھیں۔ پھر دانت دکھاتے ہوئے اس نے ماحول مزید ہیبت ناک بنا دیا۔

بلاشبہ شیر کے ارادے کچھ اور تھے۔

وہ ان گیدڑ بھبکیوں سے ڈرنے والا نہیں تھا۔

میں نے دوسرا حربہ استعمال کیا اور دو تین ہوائی فائر کئے کہ شاید فائر کی آواز سے بھاگ جائے۔ مزید کارتوس تیار رکھے کہ اگر ببر شیر نے بھاگنے کے بجائے حملہ کر دیا تو کام تمام کر دوں گا۔ فائر کی گونج ماحول میں پھیل گئی —— ببر شیر پر اثر نہیں ہوا۔ مزید کارتوس بھر کر رائفل اس کی طرف تان لی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا تو دوبارہ فائر کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

یہ اچھے آثار نہیں تھے۔ شیر خوف زدہ تھا نہ میں اس حالت میں تھا کہ اس کا نشانہ لے سکوں۔ فیصلہ کیا کہ یہاں رکنے کے بجائے گھر کی طرف چلتے رہنا چاہئے۔ راستہ صاف ہونے کی وجہ سے مطمئن تھا کہ ببر شیر پر نظر رکھ سکوں گا۔

جیسے ہی قدم اٹھایا —— ببر شیر بھی کھڑا ہو گیا اور چلنے لگا۔ میں نے دوڑنا شروع کیا تو اس نے بھی لمبے لمبے قدم لئے۔ یہ دیکھ کر میں نے سوچا کہ دوڑنا درست نہیں۔ رک گیا اور ایک بار پھر نشانہ لینے کی کوشش کی۔ مجھے بندوق تانے دیکھ کر ببر شیر لیٹ گیا —— اس طرح کہ میں اس کا جسم نہیں دیکھ سکتا تھا۔ انتظار کیا۔ جب اس نے حرکت نہیں کی تو دوبارہ چلنا شروع کیا۔ ببر شیر پھر کھڑا ہو گیا اور پیچھا کرنے لگا۔

ایسا کئی بار ہوا۔ میں رکتا تو وہ لیٹ جاتا، میں چلتا وہ بھی چلنے لگتا۔ البتہ یہ بات پریشان کن تھی کہ وہ جس انداز سے قدم اٹھا رہا تھا میرے اور اس کے درمیان فاصلہ کم ہو رہا تھا۔ وہ جتنا قریب آ رہا تھا، میں نے اتنی زیادہ احتیاط شروع کر دی تھی۔

میرے اور ببر شیر کے درمیان تقریباً سو فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ جس کمال ہوشیاری سے وہ پیچھا کر رہا تھا، میں گھبرا گیا۔ اب وسوسے نے پریشان کیا کہ اگر ببر شیر نے حملہ کر دیا تو ایسا نہ ہو کہ میں

گھبراہٹ میں فائر نہ کر سکوں۔ ببر شیر اب اتنا قریب آچکا تھا کہ بآسانی اس کے دانت اور ہلتی ہوئی دم دیکھ سکتا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے یعنی شکاری کو شکار کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔

چلتے ہوئے کبھی میدانی علاقہ آتا اور کبھی درختوں کے ہجوم اور جھاڑیوں میں سے گزرنا پڑتا۔ بعض اوقات خوف سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور سر سے پیر تک ٹھنڈی لہر دوڑ جاتی۔ اتنی گھبراہٹ تھی کہ شیر کو مارنے کا خیال ذہن سے نکل گیا۔ کوشش تھی کہ کسی طرح رہائش گاہ تک پہنچ جاؤں اور میرے اور درندے ببر شیر کے درمیان فاصلہ برقرار رہے۔ رہائش گاہ اب زیادہ دور نہیں تھی۔

آگے پہاڑیاں (چھوٹے پہاڑ) تھیں۔ جب میں آخری پہاڑی سے اترا تو اس دوران ببر شیر نے لمبے قدم لے کر درمیانی فاصلہ کم کر دیا۔ اب وہ مجھ سے تقریباً 40 فٹ دور تھا۔

مڑ کر دیکھا تو وہ فوراً جھکا اور رک گیا۔ پھر آہستہ آہستہ دم ہلاتا ہوا جھک کر چلنے لگا جیسے سانپ زمین پر رینگ رہا ہو۔ اندازہ لگائیے کہ ببر شیر کتنا عقل مند اور ہوشیار تھا۔ اسے تدبیریں آتی تھیں اور اس میں صبر بھی تھا۔ اس نے فوراً حملہ نہیں کیا، وہ موقع کی تلاش میں تھا اور منصوبہ بندی سے حملہ کرنا چاہتا تھا تاکہ میرے پاس فرار کی راہ باقی نہ رہے۔

اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی — لگتا تھا کہ آگ دہک رہی ہے۔ یہ دیکھ کر نسوں میں خون جمتا ہوا محسوس ہوا۔ میں کانپ رہا تھا — کھڑا ہونا مشکل ہو گیا۔ فاصلہ کم سے کم ہو رہا تھا۔ ببر شیر کو قریب دیکھ میں نے رفتار بڑھا دی۔ مڑ کر بھی دیکھتا رہا کہ کہیں وہ گردن نہ دبوچ لے۔

ببر شیر نے دو لمبی زقند بھریں (اچھل کر کودنا) اور مجھ سے زیادہ فاصلہ طے کر کے اگلے پنجوں پر جھک گیا۔ اب مقابلے کے سوا راستہ نہیں تھا۔ میں تیزی سے گھوما اور اس کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ لمبے لمبے ناخن والے انتہائی بڑے ببر شیر نے چھلانگ لگائی — اس کا جسم ہوا میں معلق اور منہ کھلا ہوا تھا۔ میں اسے چند قدم کے فاصلے پر دیکھ کر خوف سے لرز گیا۔ پھر زوردار آواز گونجی اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

دوستوں کی باتوں کی آواز آئی۔ کوئی میرے ہاتھ سہلا رہا تھا۔ کوئی چہرے پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔ ہوش آیا تو خود کو رہائش گاہ پر پایا۔ جسم زخمی تھا۔ پوچھا، میں یہاں کیسے پہنچا—؟

ایک دوست نے کہا، یہ تو ہم تم سے جاننا چاہتے ہیں۔ تمہاری چیخ سنی اور اس کے ساتھ گولی چلنے کی آواز آئی۔ ہم گھبرا کر دروازے کی طرف دوڑے۔ ہم کنڈی کھول رہے تھے کہ تم نے اس زور سے دروازے پر ٹکر ماری جیسے تم خود نہیں آئے، کسی نے توپ کے ذریعے پھینکا ہو۔ پھر تم بے ہوش ہو گئے۔ کیا ہوا تھا—؟

میں نے انہیں بتایا کہ ببر شیر پیچھے لگ گیا تھا اور اس کے ساتھ تفصیل بتائی۔ وہ حیران تھے کہ میں ببر شیر کے وار سے کس طرح بچ گیا لیکن صورت حال جاننے کے لئے کسی نے باہر جانے کی ہمت نہیں کی۔

صبح ہوئی۔ سب نے رائفل اٹھائی۔ میں انہیں اس جگہ لے گیا جہاں ببر شیر نے حملہ کرنے کے لئے چھلانگ لگائی تھی۔ چند فٹ کے فاصلے پر ببر شیر مل گیا۔ پتھر کی طرح ساکت۔ وہ زمین پر گرا ہوا تھا اور میری رائفل اس کے قریب پڑی تھی۔

نرم زمین پر پنجوں اور قدموں کے نشان بتا رہے تھے کہ رات یہاں کیسی بازی کھیلی گئی اور کس نے کیا چال چلی۔ قدموں کے نقوش سے واضح تھا کہ میں رات کو کس جگہ کھڑا تھا، ببر شیر نے آخری جست کہاں بھری اور پھر مجھ سے ایک فٹ کے فاصلے پر گر گیا۔

ظاہر تھا کہ غیبی مدد ہوئی۔ میں نے لاشعوری طور پر اس وقت فائر کیا تھا جب ببر شیر ہوا میں تھا۔ وہ گولی لگنے کی وجہ سے مجھ پر گرنے کے بجائے فاصلے پر گرا۔

میں کب بھاگا، رائفل میں نے پھینکی تھی یا خود گری — کچھ یاد نہیں۔ نشانات بتا رہے تھے کہ میں تڑپتے ہوئے ببر شیر کو پھلانگ کر رہائش گاہ کی طرف بھاگا تھا۔

جب ہم نو فٹ لمبے پہاڑی ببر شیر کی کھال اتار رہے تھے تو معلوم ہوا کہ گولی سینے میں لگی تھی جو دل کو پاش پاش (ٹکڑے ٹکڑے) کرتے ہوئے پار ہو گئی۔

موت سر پر تھی لیکن اللہ نے بچا لیا۔ سچ کہتے ہیں کہ جسے اللہ رکھے، اسے کون چکھے۔

# آزاد پنچھی

فریحہ کے گھر میں خوب صورت باغ تھا۔ باغ میں رنگ رنگ پھول تھے جن پر تتلیاں رقص کرتی تھیں اور پرندے چہچہاتے تھے۔ فریحہ کو ان سے لگاؤ تھا۔ تتلیوں اور پرندوں سے باغ میں رونق تھی۔ پرندے فریحہ سے مانوس ہو گئے تھے۔

ایک صبح گھاس پر ننھی چڑیا زخمی حالت میں پڑی ہوئی نظر آئی۔ فریحہ اسے اندر لائی اور زخم پر مرہم لگایا۔ چڑیا تکلیف میں تھی، درد میں کمی آئی تو سو گئی۔ نیند سے جاگنے کے بعد طبیعت بہتر تھی۔ چڑیا نے فریحہ کا شکریہ ادا کیا اور اڑ گئی۔

چڑیا کا گھونسلا باغ سے کچھ دور درخت پر تھا۔ روزانہ باغ میں دانہ چگنے آتی اور فریحہ کے کندھوں پر بیٹھ جاتی۔ دونوں دوست بن گئے۔ ایک روز چڑیا نہیں آئی۔ فریحہ انتظار کرتی رہی۔ تین دن گزر گئے۔ تیسرے دن پڑوس میں سے فریحہ کی سہیلی نادیہ آئی۔ اس نے کہا، میرے گھر چلو، تمہیں کچھ دکھانا ہے۔ نادیہ کے گھر گئی تو دیکھا کہ ننھی چڑیا جس کا تین دن سے انتظار تھا، پنجرے میں قید ہے۔

نادیہ نے کہا، کتنی خوب صورت چڑیا ہے۔ تین دن پہلے پکڑی ہے۔

فریحہ پریشان ہو گئی۔ دکھ بھرے لہجے میں کہا، اللہ نے پرندوں کو اڑنے کے لئے پَر دیئے ہیں۔ آزاد فضا کے آزاد پنچھی کو قید کرنا ظلم ہے۔ تمہیں کوئی قید کر لے، کیسا لگے گا؟ میری بہن، ہمیں اللہ کی مخلوق کو قید نہیں کرنا چاہئے۔ ایسا کرنے سے ہم خود کسی مشکل میں قید ہو جاتے ہیں۔ چڑیا کو آزاد کر دو تاکہ یہ خوش رہے اور تم بھی خوش رہو۔

سہیلی کی بات نے نادیہ کے دل پر اثر کیا۔ آگے بڑھی اور پنجرا کھول دیا۔

چڑیا خوشی سے چوں چوں کرتی ہوئی اڑ گئی۔

# سمجھ سمجھ کر ــــ سمجھ کو سمجھو

دادا جی حسن اور آمنہ کے بہت اچھے دوست تھے۔ دونوں بچے دادا جی کو ہر بات بتاتے تھے۔ دادی اماں پوچھتی تھیں کہ بچو! دادا جی کے کان میں کیا کھسر پھسر کر رہے ہو، مجھے بھی بتاؤ۔

دادا جی مسکرا کر کہتے، ارے بھئی دوستی کا اصول ہے کہ دوستوں کی بات ــــ دوستوں کے درمیان رہے۔ دادی مسکرا دیتیں۔

رات کا کھانا سب ساتھ کھاتے اور اس کے بعد قہوہ پیتے تھے۔ قہوہ ہاضمے میں مدد دیتا ہے۔ دادا جی نے قہوے کی محفل کا اصول بنایا تھا کہ ادھر ادھر کی باتوں کے بجائے علمی گفتگو ہو یا کوئی ایسی کہانی سنائی جائے جو سبق آموز ہو۔ سب کی باری طے تھی۔ اس نشست سے حسن اور آمنہ نے سیکھا کہ خیالات کا اظہار کس طرح کیا جاتا ہے۔

آج دادا جی کی باری تھی۔ انہوں نے قہوے کی پیالی سے آخری گھونٹ لیا اور پیالی ٹرے میں رکھتے ہوئے دلچسپ کہانی سنائی۔

کاشف اور کامران پڑوسی تھے۔ دونوں کو باغبانی کا شوق تھا البتہ باغ کی دیکھ بھال کا انداز مختلف تھا۔ کاشف ضرورت کے مطابق پودوں کا خیال رکھتا تھا۔ ان سے باتیں کرتا، ہر چوتھے روز پانی دیتا اور وقت پر گوبر اور کھاد ڈالتا تھا۔

کاشف کا پڑوسی کامران دور دراز علاقوں سے منفرد پودے لاتا تھا۔ پودے خوش رنگ، ہرے بھرے تھے۔ کامران ہر دوسرے روز پودوں کو پانی دیتا تھا۔ پندرہ دن کے بعد دوائی ڈالتا کہ کیڑے نہ لگیں، ہر ہفتے گوڈی کرتا، چھ مہینے بعد گملوں کی مٹی تبدیل کرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ گملے پانی سے تر رہیں۔

کاشف کامران کو سمجھاتا تھا کہ پودوں کو اتنا پانی نہیں دیا کرو، کم زور ہو جاتے ہیں۔ کامران کا کہنا تھا کہ زیادہ کھانے سے بھی کوئی کم زور ہوا ہے۔ زیادہ خوراک سے پودے تازہ رہیں گے۔

آسمان رات کو بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ گرج چمک کے ساتھ خوب بارش ہوئی۔ صبح ہوئی تو دونوں دوستوں نے باغ کا معائنہ کیا۔ کاشف کا باغ اچھی حالت میں تھا۔ صرف چند پودوں کے پھول پتّے شاخ سے جدا ہوئے تھے ـــــ لیکن کامران کے باغ کی حالت ابتر تھی۔ کئی پودے گر گئے تھے ـــــ جڑیں نظر آ رہی تھیں۔

کاشف سے پوچھا، میرے باغ کا یہ حشر کیوں ہوا؟ میں تم سے زیادہ پودوں کا خیال رکھتا ہوں۔ تمہارا باغ سلامت ہے اور میرا ویران ہو گیا۔

کاشف بولا، حقیقت یہ ہے کہ میں تم سے زیادہ پودوں کا خیال رکھتا ہوں۔ خیال رکھنے کا مطلب یہ نہیں کہ انہیں بلا ضرورت پانی اور خوراک دی جائے۔ تم نے پودوں کو خود سے کچھ کرنے نہیں دیا اس لئے ان میں موسم کی سختی برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رہی اور ہر دوسرے دن پانی ملنے سے یہ حساس ہو گئے۔

کیا مطلب؟ کامران نے پوچھا۔

کاشف نے جواب دیا، میں پودوں کو کم پانی دیتا تھا۔ مزید پانی کی ضرورت ہوتی تو ان کی جڑیں زمین میں پانی تلاش کرتیں۔ پانی کی تلاش میں جڑیں پھیلتی ہیں اور مٹی میں راستہ بناتی ہوئی زمین میں مضبوطی سے پیوست ہو جاتی ہیں۔ زمین سے انہیں پانی ملتا ہے اور یہ توانا ہو جاتے ہیں۔ اس وجہ سے میرے پودے موسم کی سختی برداشت کر گئے۔ تم نے زائد پانی دیا تو پودے کی جڑیں سست ہو گئیں۔ زائد پانی سے جڑ نرم ہو جاتی ہے اور مرجھانے کا خدشہ ہوتا ہے۔ ناز و نعم میں پلا پودا مشکل حالات سے نہیں لڑ سکتا۔

کامران نے سنا تو کہا، بھائی! کاش میں تمہاری بات پہلے مان لیتا۔

کاشف اور کامران کی کہانی سنا کر دادا جی نے پوچھا، جی بچو! بات سمجھ میں آئی؟

سب خاموش تھے۔ دادا جان نے شعر سنایا،

سمجھ سمجھ کر سمجھ کو سمجھو سمجھ سمجھنا بھی اک سمجھ ہے
سمجھ سمجھ کر جو نہ سمجھے میری سمجھ میں وہ ناسمجھ ہے

کہانی کے ساتھ قہوے کی محفل بھی ختم ہوئی۔

چھوٹے بڑے بچو! قلم کاغذ اٹھائیں اور لکھیں کہ کاشف اور کامران میں سے کس نے سمجھ داری کا مظاہرہ کیا۔ جواب کا انتظار رہے گا۔

# خواب تعبیر اور مشورہ

## نیکی کا راستہ

**ف ب، چنیوٹ:** ایک بزرگ خاتون کے دفتر کے باہر کھڑی تھی کہ آواز آئی، اندر آجاؤ۔ دفتر بہت خوب صورت ہے۔ میں ادب سے نظریں جھکائے کھڑی ہوں۔ بزرگ خاتون تشریف لاتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ میرا بریف کیس اٹھاؤ۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ جاتی ہیں، میں پیچھے پیچھے چلتی ہوں۔ راستہ بہت خوب صورت ہے۔ کچھ دیر بعد محسوس ہوا کہ بزرگ خاتون اڑ رہی ہیں، ان کے ساتھ میں بھی اڑ رہی ہوں۔

گھر پہنچ کر بریف کیس رکھا اور باادب کھڑی ہوگئی۔ ایک لڑکی آکر بزرگ خاتون کو ان لوگوں کے نام بتاتی ہے جن کے فون آئے تھے۔ ایک نام سن کر وہ ناراضی کا اظہار کرتی ہیں۔ میں روتے ہوئے ان کے قدموں میں بیٹھ جاتی ہوں کہ مجھ سے ناراض مت ہوں۔ وہ فرماتی ہیں، نہ میں نے آپ سے کچھ کہا اور نہ میں ناراض ہوں، آپ مت روئیں۔ پھر دفتر سے کچھ لانے کا حکم دیا۔ جب میں وہ چیز لا رہی تھی تو راستہ نظر نہیں آیا۔ ادھر ادھر گھوم کر واپس آئی اور ان کو بتایا کہ راستہ نہیں مل رہا تھا۔ انہوں نے فرمایا، میرے پاس بیٹھ جاؤ، ایسا نہ ہو کہ راستہ بھول جاؤ۔ میں وہیں بیٹھ جاتی ہوں۔ پھر آنکھ کھل گئی۔

**تعبیر:** جب کوئی دو راستوں پر چلنا چاہتا ہے اور انتخاب نہیں کر سکتا کہ کس راستے پر چلنے میں خیر ہے اور کس راستے پر چلنے میں پریشانی ہے تو اس قسم کے الجھے ہوئے جذبات، خواب میں نظر آسکتے ہیں۔ بزرگ خاتون نے آپ کو ہدایت کی ہے کہ ذہنی یکسوئی کے ساتھ نیکی کا راستہ اختیار کیجئے، زندگی سنور جائے گی، انشاء اللہ۔ چلتے پھرتے وضو بے وضو یا حی یا قیوم پڑھتی رہئے۔

## آٹھ سال

**ا۔ ع، برطانیہ:** آٹھ سال پہلے ہم جس مکان میں رہتے تھے اس مکان کو نو (9) دفعہ خواب میں دیکھ چکی ہوں کہ ہم وہاں رہنے جارہے ہیں۔ وہ مکان چھوڑنے کے بعد کئی مکانات بدلے ہیں مگر خواب میں وہی مکان نظر آتا ہے۔

**تعبیر:** آٹھ مکانات تبدیل کرنے کی وجوہات کیا ہیں ــــ؟ کیا ان مکانوں میں جو آپ نے چھوڑے

ہیں، کوئی نادیدہ شے نظر آتی تھی۔۔۔؟ خواب کے اجزا ظاہر کرتے ہیں کہ گھر میں صفائی کا معیار ناقص ہے۔ مجموعی طور پر اگر آپ غور کریں گی تو برتن دھونے کے بعد پلیٹ میں چکنائی کا اثر باقی رہتا ہے جس کی وجہ سے ایسے جراثیم پیدا ہوسکتے ہیں جو بظاہر نادیدہ ہیں۔ برتن اچھی طرح دھوئیے اور دھونے کے بعد دھوپ میں رکھ دیجئے۔ اس کے بعد برتنوں کو صاف کپڑے سے صاف کرکے استعمال کیجئے۔ اس قسم کے خواب نظر نہیں آئیں گے، انشاءاللہ۔

## کالی بلی

**م،ع:** سہیلی کے ساتھ ایک بزرگ سے ملاقات کے لئے حاضر ہوئی۔ دور سے دیدار ہوا۔ وہاں ایک اور صاحب بھی بیٹھے ہیں۔ سہیلی سے کہتی ہوں، دور سے صحیح مگر دیدار تو ہوا۔ کمرے سے کسی کے باہر آنے پر کہتی ہوں، ان کی ملاقات ہوگئی، شاید ہماری بھی ہوجائے۔ سہیلی کہتی ہے چلو تیار ہوجائیں۔ اس دوران کالی بلی وہاں سے گزری جس پر میں نے دھیان نہیں دیا لیکن وہ میرے بائیں بازو میں دانت گاڑدیتی ہے۔ ہاتھوں کو جھٹکا دیتی ہوں مگر اس نے اتنی مضبوطی سے دانت گاڑے ہیں کہ چھوڑ نہیں رہی۔ دانتوں کی چبھن محسوس ہوئی۔ پھر چوزوں کو دیکھنے کے لئے ان کے ڈربے میں جھانکا تو وہاں چھپے ہوئے سانپ نے اچھل کر میرے گال پر کاٹا اور واپس ڈربے میں چلا گیا۔ میں نے پلاسٹک کی تھیلی تلاش کی اور سانپ کو نکالنے کے لئے ڈربے میں ہاتھ ڈالا۔ سانپ باہر آیا تو اس کا منہ تھیلی میں بند کرکے گرہ لگاتے ہوئے کہا کہ اب یہ کسی کو نہیں کاٹے گا۔ منظر بدلا جس میں سیاہ کتّے نے گال پر کاٹا اور غائب ہوگیا۔

**تعبیر:** خواب میں دیکھی ہوئی علامتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ بیمار ہیں یا آپ کے اندر بیماریوں کے نقوش ہیں۔ نقوش بتارہے ہیں کہ آپ ذہنی طور پر ڈسٹرب ہیں۔ نظامِ ہضم ٹھیک نہیں ہے۔ خواب میں بلڈ پریشر کے بھی نقوش ہیں۔ ڈاکٹر سے پورا معائنہ کروایئے اور پرہیز کے ساتھ علاج کیجئے اللہ تعالیٰ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ آپ نے جو خواب دیکھا ہے وہ اس بات کی نشان دہی ہے کہ آپ ذہنی طور پر ڈسٹرب رہتی ہیں۔

## نمک

**رابعہ بشیر، ساہیوال:** میرے پرانے کالج کے میدان میں کنواں ہے جس کے کنارے چوڑے ہیں۔ کناروں پر جانماز بچھاکر نماز پڑھ رہی ہوں۔ کنوئیں میں گرنے کے خوف سے وہاں سے ہٹتی ہوں اور گھاس پر نماز پڑھتی ہوں۔ کوئی شخص میرے سامنے مذہبی کتابیں پھیلا کر بیٹھ جاتا ہے۔

اس نے بتایا کہ اس کی بیٹی سامنے میدان میں کھیل رہی ہے۔ پھر وہ اپنی بیوی کے بارے میں کچھ بتاتا ہے۔ میں اس کی باتوں پر توجہ نہیں دیتی مگر وہ کچھ نہ کچھ بتانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہاں سے بھاگتی ہوں لیکن وہ بہانے بہانے سے سامنے آجاتا ہے۔

**تعبیر:** غذا میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ کھانوں میں کسی بھی صورت نمک کی زیادتی illusion خیالات کی وجہ بن سکتی ہے۔ Low بلڈ پریشر کے علاوہ اس میں بھی ڈاکٹری مشورہ ضروری ہے۔ علاج یہ ہے کہ آپ باسی اور نمکین اشیا سے پرہیز کیجئے۔ کچھ عرصہ کھانوں میں نمک ہلکا رکھئے اور اس کے بعد نمک کھانا چھوڑ دیجئے۔

## فلم بینی

**خاور، حیدرآباد:** بیٹے اور بیٹی کے ساتھ تانگا نما ٹھیلے پر بیٹھا ہوں۔ خوب صورت گھوڑا جتا ہوا ہے جو منہ زور ہے۔ راستے میں حسین مناظر ہیں۔ فلک بوس پہاڑوں سے آبشاریں بہہ رہی ہیں جب کہ راستہ اونچا، پتھریلا اور دلدلی ہے۔ چوٹی کے قریب ٹھیلے سے گھوڑا الگ ہو گیا مگر میں اس کی لگام پوری طاقت سے کھینچ رہا ہوں کیوں کہ گھوڑا ذرا سا بھی بدکا تو ٹھیلے کی لکڑیاں الگ الگ ہو جائیں گی۔ جب ہمارا رخ نیچے کی طرف ہوا تو بیٹا چیخا کہ اگر گھوڑا نہیں رکا تو آبشار ہمیں بہا کر غاروں کو قبریں بنا دے گی۔ میں نے اسے تسلی دینے کے ساتھ ڈانٹا۔ بیٹا گھبرا کر ٹھیلے سے گر گیا۔ اونچائی سے گرنے والے ایک آبشار نے جس میں طوفانی اثرات تھے، بیٹے کو کنوئیں میں پھینک دیا۔ میں نے ہموار جگہ دیکھ کر ٹھیلا روکا پھر بھاگ کر کنوئیں تک گیا۔ اندر دیکھا تو بیٹے کا ہاتھ نظر آیا۔ کنوئیں میں چھلانگ مارنے کا ارادہ کرتے ہی ترک کرنا پڑا کیوں کہ کنوئیں کی چوڑائی بہت کم ہونے سے خدشہ تھا کہ میں بیٹے کے اوپر گرتا اور وہ مزید نیچے چلا جاتا۔ اندر جھکا مگر بیٹے کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش ناکام ہو گئی۔ دیکھا کہ ہاتھ دوبارہ اوپر آیا جس پر کنوئیں کی ایک اینٹ رکھی ہے۔ پھر اینٹ ہاتھ سے چھوٹی جس کے ساتھ ہاتھ بھی پانی کے اندر چلا گیا۔ میں شدتِ غم سے رونے لگا۔ آنکھ کھل گئی۔

کچھ عرصہ پہلے دیکھا کہ قبر کے سرہانے تدفین کے لئے لوگ کھڑے ہیں۔ میں قبر میں لیٹا ہوں۔ باہر کھڑے لوگوں سے کچھ اشیا مانگتا ہوں۔ احساس ہوا کہ جب قبر بند کرنے کے بعد یہ لوگ چلے جائیں گے تو میں اندھیرے اور تنہائی میں کیسے رہوں گا۔ بے قراری اور پریشانی میں بھاگنے کا خیال آیا۔ پھر یہ سوچ کر رک گیا کہ بھاگ کر بھی کہاں جاؤں گا اور کب تک بھاگتا رہوں گا کیوں کہ یہ تو وہ محور ہے جس کے گرد نوعِ آدم گھوم رہی ہے۔ آج میں ہوں، کل میرے باپ آدم کا دوسرا

بیٹا ہو گا۔ پھر خیال آیا کہ میں اکیلا نہیں ہوں، چاروں طرف قبروں میں لوگ ہیں۔ یہ سوچنے کے بعد وہاں موجود لوگوں سے کہتا ہوں کہ قبر اچھی طرح بند کر کے روانہ ہو جاؤ۔ اور آنکھ کھل گئی۔

**تعبیر:** سہل انگاری (کاہلی، لاپروائی)، آسائش پسندی، آرام طلبی کے ساتھ تکلفات کا شوق ہے اور یہ چیزیں ماحول کا حصہ بن گئی ہیں۔ آپ فلم دیکھنے میں وقت کا بے جا اسراف کرتے ہیں اور طبیعت کے برا محسوس کرنے پر ذہن تاویل دیتا ہے کہ سب ہی لوگ یہ تفریح کرتے ہیں، دوسری کیا چیز کی جائے۔

**تجزیہ:** خواب میں موجود تمثلات بڑوں کے مشاغل کی وجہ سے بنے ہیں۔ مثلاً آسائشوں کے ساتھ سہل انگاری، تکلفات، آرام پسندی وغیرہ۔ ان تصورات کا منبع آباؤ اجداد ہیں۔ بے لگام گھوڑے پر قابو پانے کی ناکام کوشش پھر افسوس، موجودہ حالات کا مظاہرہ ہے۔ خوب صورت منہ زور گھوڑا، آبشار، کنواں اور لڑکے کا ڈوبنا سب تکلفات کی علامات اور شبیہیں ہیں۔ تکلف سے بھری ہوئی زندگی کی وجہ سے حالات میں ہونے والی پیچیدگی کا اظہار پتھریلا اور ناہموار راستہ ہے۔ کنوئیں میں چھلانگ نہ لگانا مگر اس میں ہاتھ ڈالنا پھر بچے کے ہاتھ کو نہ دیکھنا ظاہر کرتا ہے کہ بیان کئے گئے طرزِ عمل سے نقصان اور تکلیف پہنچی ہے۔ تدفین کے لئے لوگ، قبر میں لیٹنا، بھاگنے کی کوشش کا خیال اور اسے رد کرنا، آپ کے اندر فلم بینی اور اسراف کی نشانیاں ہیں۔

**مشورہ:** تفریح ایسی کی جائے جس میں وقت اور دولت ضائع نہ ہو۔ ہر بات کا جائزہ لینے اور طریقِ کار میں حالات کے مطابق تبدیلی کی ضرورت ہے۔ نتائج بہتری کی طرف گامزن ہوں گے، انشاءاللہ۔

## آدھا حصہ زمین

**راشد، کراچی:** ہرے رنگ کے کپڑے سے آٹا ڈھانپ لیا۔ بھورا کتّا آیا اور آٹا کھانے لگا۔ میں نے اسے کان سے پکڑ کر مارتے ہوئے باہر نکالا۔ کنڈی لگا کر آیا تو دیکھا کہ کالی بلی آٹا کھا رہی ہے۔ بلی کو بھی مار کر باہر نکالا۔ پھر دیکھا کہ کتّا تالاب میں نہا رہا ہے۔ اچانک تالاب کی زمین اوپر آگئی جس سے آدھا کتّا زمین میں چلا گیا اور چیخ و پکار کرنے لگا۔ پھر کہا کہ مجھے باہر نکالو۔ میں نے کہا، اسی میں پھنس کر چلّاتے رہو۔ یہ کہہ کر تیزی سے مڑ گیا۔

**تعبیر و تجزیہ:** خواب نزلہ، دماغ، معدہ اور آنتوں کی بیماریوں سے متعلق ہے۔ ان بیماریوں نے آپ کے جسم کو شکار بنالیا ہے۔ معدہ اور آنتوں کی بیماریاں پانی، کتّا، تالاب، کتّے کا آدھا حصہ زمین میں ہونے کی شکل میں ظاہر ہوئی ہیں۔ جب کہ

دماغ اور نزلے کے امراض کالی بلی اور آٹا کھانے کی شکلوں میں ظاہر ہوئے ہیں۔ آپ نے کتّے کو کان سے پکڑ کر باہر نکالا پھر بلی کو آٹا کھاتے دیکھا۔ اس کا مطلب ہے کہ جس معالج سے علاج کروایا گیا، وہ تجربہ کار نہیں تھا۔

## شیخ چلی

**کامران، عید گاہ:** جس جگہ سو رہا ہوں وہاں دو کالی بلیوں میں سے ایک نے مجھ پر بندوق تان لی۔ خواب میں آنکھ کھلی۔ میں نے اس کی گردن پکڑلی کھال ڈھیلی ہونے کے ساتھ ساتھ نرم و ملائم تھی۔ بندوق کھول کر دیکھی تو پتہ چلا کہ اس میں گولیاں نہیں ہیں۔ بلیوں کو آزاد کر دیا۔

**تعبیر:** خواب میں آپ کے ذہن میں موجود ایسی دو خواہشات کی نشان دہی کی گئی ہے جن کو بہت اہمیت دی گئی۔ ایک خواہش شیخ چلی کا خواب ہے، اس سے ذہن ہٹالیا جائے۔ کوشش پر نگاہ ہونی چاہئے کیوں کہ پہلے سے نتائج کو اخذ کرلینا خوف پیدا کر کے نتائج میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔

**تجزیہ:** دو اہم خواہشات دو بلیوں کی صورت میں ہیں۔ بندوق سے حملہ کرنا لیکن اس میں گولی نہ ہونا

ماہنامہ قلندر شعور نومبر 2020ء

## آپ کے خواب اور ان کی تعبیر

پورا نام:..... والدہ صاحبہ کا نام: .....

پورا پتہ:.....

ازدواجی حیثیت:.....وزن (تقریباً): .....آنکھوں کا رنگ.....

نیند کیسی آتی ہے:.....بلڈ پریشر (نارمل/ہائی/لو):..... تاریخ پیدائش:.....

میٹھا پسند ہے یا نمکین چیزیں زیادہ مرغوب ہیں؟.....فون نمبر.....

خدانخواستہ دماغی، نفسیاتی مرض اور وہم کے مرض میں مبتلا ہوں تو ضرور لکھیں: ہاں / نہیں

مختصر حالات : .....

.....

اشارہ ہے کہ ہوائی قلعے بنائے جاتے ہیں۔ جانور کی گردن پکڑنا پھر اسے آزاد کرنا نصیحت ہے کہ کوشش میں وقت زیادہ لگایا جائے اور بے معنی باتوں سے پرہیز ضروری ہے۔

**عمارہ خاتون، جگہ نہیں لکھی: تعبیر:** اہم یہ ہے کہ پہلے طرز فکر کا محاسبہ کیا جائے۔ ذہن جن باتوں کو غلط کہتا ہے اس سے توجہ ہٹالیجئے۔ اچھے اثرات کو قبول کیجئے۔ زیادہ سے زیادہ باوضو رہئے۔ رات سونے سے پہلے بھی وضو کیجئے۔ دیئے گئے مشوروں کو غور سے پڑھ کر سمجھئے اور عمل کیجئے۔ انشاء اللہ ڈراؤنے خوابوں سے نجات مل جائے گی۔ صبح کی نماز سے پہلے یا بعد میں 40 منٹ سیر کیجئے اور چلتے وقت یا حی یا قیوم کا گنتی کے بغیر ورد کیجئے۔ فجر سے پہلے چہل قدمی کر سکیں تو زیادہ بہتر ہے۔

**فاطمہ، پنجاب۔ تعبیر:** خواب پریشان خیالی کا مظہر ہے۔ اس حالت سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے کیوں کہ پریشان خیالی سے ذہنی توانائی ضائع ہوتی ہے۔

## جو سنا اور دیکھا، وہ کیا ہے؟

زمانہ قدیم سے آدمی کے لئے خواب دیکھنا معمّا ہے۔ جب آدمی سوتا ہے تو اس کے حواس مادی دنیا سے بے خبر ہو جاتے ہیں لیکن وہ خواب میں بیداری کی طرح خود کو چلتا پھرتا، باتیں کرتا اور سارے کام کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ طرح طرح کے مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ عموماً وہ یہ کہہ کر خواب کو رد کر دیتا ہے کہ یہ تو محض خیالات اور وہ باتیں ہیں جن سے میں بیداری میں گزرتا ہوں۔ باتیں حافظے میں محفوظ ہو جاتی ہیں پھر نیند میں یاد آتی ہیں۔ لیکن آدمی بہت سے خواب ایسے بھی دیکھتا ہے جن کا تاثر گہرا ہوتا ہے۔ اس کے اندر ذوق و تلاش بیدار ہوتی ہے کہ جو کچھ خواب میں دیکھا، کیا اور سنا، وہ کیا ہے؟ یا وہ ایسا خواب دیکھتا ہے جو کچھ عرصے بعد بیداری میں من و عن پورا ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر وہ چونکتا ہے کہ یہ کیا ہوا۔ بالآخر تفکر اور مشاہدات سے راہ نمائی ہوتی ہے کہ خواب کی دنیا محض خیالات نہیں بلکہ اس کے اندر اسرار پنہاں ہیں۔

قارئین! کبھی سوچا ہے کہ خواب میں دیکھے گئے عمل کا اثر بیداری میں کیسے منتقل ہوا؟

see the formless reality behind everything. Our relationship cannot be severed in any circumstance, we are now bound to each other in duty towards the Divine." Saying this, the master stood up, embraced him and before he could respond, disappeared into the wilderness.

It was time to leave the tree house. He packed his belongings and took a final look out of the window. He wished well and prayed for the forest and the creatures within it. He prayed for the ancient tree, the river, the valley and the mountain. His heart was a swelling ocean of love. He knew he had a huge responsibility of representing his master's teachings. His heart knew his master was around him 24/7. His heart was free of fear and sadness, ready to meet life afresh.

As he alighted the stairs, he saw that the jeep had arrived to take him back. He smiled at the staff member and wished him well warmly. "He is my soul brother," his heart whispered. The staff member was pleasantly surprised at his warmth as he had not met many guests who had taken the lead of greeting.

As the jeep winded through the tall trees, he began to hum the lines he had written and dedicated to his master,

*"I thought the peak of love was loving you;*

*Until I learnt how to love everyone, as you.*

*My heart constantly sings songs of union,*

*With you my master and with my Creator Divine.*

*From Him I came, to Him I shall return,*

*With you as my guiding light at every turn."*

(The End)

## Rainbows

Sensing the magnificent yellow on the backs of the bees,

Inhaling the elegance of purple on tulips,

Savouring the spice of oranges and reds from the sand,

coming with a touch of sweetness from clouds of white.

The green of grass, the blue of oceans, the black under the stars;

My eyes mirror them in awe. And now, in astonishment of the spectrum before us.

Eyes still a camera, the mind still the screen, as water droplets fall.

The simple droplet now becomes the eye, reflecting,

But this time, for the world to see.

— Chaitali Prabhu

es back and heals herself each time. Have you heard of the planet giving up or not restarting?"

He shook his head to say 'no' again and this time he was feeling uneasy as he thought of all the magnificent qualities of the Earth. He thought on how even though mankind is known as the best of all creations, they did not display even 10% of what mother Earth displayed day in, day out. He was feeling really ashamed of himself.

"A seeker must never give up trying no matter how this path tests their resilience," The master continued.

"The Earth is also a symbol of justice and balance; as she creates, she also destroys to reinstate balance within her. She has the courage to destroy parts of her and her children to reinstate peace and balance. What does this tell you?" Asked the master.

"It tells us that in order to progress on this path, it is very important for us to destroy our own vices and weaknesses to bring ourselves to alignment," he replied after deep thought.

"The Earth is in constant service to her children and the greatest service she does is that she embraces each one of us in our death, no matter how good or bad we have been throughout our lives, and wraps us without discrimination in her love. Hence, our bodies dissolve back into her with dignity. What do you learn from this?" the master asked.

"Mankind is constantly trying to outdo one another by exposing each other's darkest secrets. We are constantly dragging each other down and clambering up the ladder of material success. We must embrace the good and bad in our brothers and sisters and wrap them in our unconditional love so that they dissolve their individuality and move towards the path of neutrality as unified souls. We must love each other and live like a large joint family," he replied with a deep sense of peace and bliss.

They had reached the edge of the lake next to the tree house. He had not realised that the night had slipped by and it was dawn. The sun was just rising over the horizon. He knew the darkness within his heart had faded too and that the bright light of his master's wisdom had illuminated it. The master was sitting peacefully in a meditative trance by the lake waters. He sat down besides the master and placed his head on his blessed knees. The master stroked his head and gently pulled his knee away and ushered him to sit up. His eyes were streaming with tears.

The master asked him to focus on his heart as he began the process of initiation. "You are now my spiritual son and I, your guide. My duty is to take your awareness back to who you truly are and thereby prepare you for the grand union with your Creator. From Him we come and to Him we all return. I will be around you in all ways and forms until you learn to

routine life and she has never travelled off course on a beautiful vacation or taken a break for rest; she is circling around the same sun for millions of years and has been doing her duty without fail. Just think, what if she decided she was bored and shifted from her course? What if she decided she could spin faster or slower or decided to move in the opposite direction?"

He frowned, "Humanity would suffer immensely and perish. The seasons would not exist. With the change of seasons, the natural growth cycles of the biosphere would be affected. Creatures would just not be able to survive. The change in the direction of rotation would produce winds that would travel at a speed of thousands of miles per hour. Every single part of the planet and everything that is not anchored to the bedrock would rip off the top layers due to the force of the winds and the planet would be enveloped in a hurricane.

Earth would be engulfed in thick clouds of dirt and debris for millions of years. Earthquakes of very high magnitude would erupt. The crust of the earth would liquefy and the polar ice caps would melt. With the change in temperature, the sea levels would rise and create great floods. The carbon dioxide levels in the atmosphere would also increase due to the resultant greenhouse heating. Parts of the planet would eject into space and rain down back upon the Earth as meteor showers." His eyes were terror struck as he heard his own words.

The master glanced at him with a smile and asked, "But she has not been displaying her wish for change, has she? She has been focused and committed on her path for our survival. She is steadfast. No matter how her own children have tried to destroy or harm her, she has not shifted from her path of duty, has she?"

He shook his head in shame to say 'no'.

The master's voice echoed, "Discipline is key on this path and a seeker must be steadfast, committed and focused."

He shook his head in affirmative.

The master then spoke thus, "Now let us discuss her resilience. The earth goes through a complete destruction every 10,000 years. Lands have submerged under water many a times and new land has birthed out of the submersion. At times, the Earth was wiped out up to 95% of its existence and yet each time, she has sprung back. She has gone through hardship to be able to cultivate resources within her bosom that can be used by us to live. These metals you mine, trees you use, water you drink, stones you use to build, have taken millions of years to come to this form. What has taken her a million years to birth, we destroy it in matter of seconds. Yet she bounc-

i

# Circle of Life

*From Him we come, to Him we return*

*"The Earth is also a symbol of justice and balance; as she creates, she also destroys to reinstate balance within her. She has the courage to destroy parts of her and her children to reinstate peace and balance. What does this tell you?"*

He was crying softly as they made their way back to the tree house. His heart was eager to set foot on the path of self-actualisation but also wanted to hold on to the evening that was quickly slipping by.

Night was replacing the day and he knew that the morning held his return to the buzzing material world. He did not know when he would be permitted to return to the wilderness next. He would miss the magnificent glory of Mother Earth around him.

He glanced at the tall mountains, the green valley, the gushing river, the setting sun, the blowing breeze and inhaled slowly and deeply, exhaling with a soft sigh. When he looked ahead, he saw that the master was looking at him with great interest.

Feeling shy under the penetrating glance, he bowed his head in respect. This feeling of surrender and respect was new to him. He had realised now that holding one's head high was not true success; bowing one's head in total submission was true achievement.

He looked up when he heard the master pose a question to him, "What do you learn from the Earth?"

He was rather taken aback. He had not expected the conversation to move in the direction of the planet. "We refer to the planet as Mother Earth, as she has birthed all the resources needed for our existence out of her womb and nourishes each of us with them. She is kind, giving, compassionate and selfless. She wants nothing from us and is constantly engaged in serving us. She discriminates between none and treats all species equally with kindness."

As he stopped, he felt a circle of energy moving through his abdomen and love oozing out of his heart. He could not but feel the love of Mother Earth as he looked at the nature around him.

The master let him experience the feelings of love fully and then spoke, "Live like the Earth. You have summarised your understanding of her well. But more challenging than this is to live like her. Look at her; she is suspended in mid air with no base to rest on, yet she has never lost her balance. She is constantly spinning at great speed around a fixed path around the ball of fire we call the Sun. She has never tilted or shifted from her axis, she has never expressed her boredom of living a

mined heart."

He then addressed Khwaja Ghareeb Nawaz (RA) and said, "O Khwaja! Your soul shines bright, however, there is one problem."

Khwaja Sahib (RA) smiled and said, "What is it?"

He replied, "Your soul is beautiful, but I see a dark spot in your heart."

"Yes, you are right," he said.

The sadhu said, "This blemish does not suit the soul that is so illumined and elevated. I wish I could help you in removing it."

"You can certainly help me in removing the dark spot," said Khwaja Ghareeb Nawaz (RA).

Struck by the beauty of Khwaja Sahib's (RA) soul, the sadhu became teary eyed and said with quivering lips, "My life is at your service. Do tell me how can I do it."

Khwaja Ghareeb Nawaz (RA) said, "If you accept God's Prophet Muhammad (PBUH), this blemish will vanish."

The sadhu did not understand the rationale behind the words of Khwaja Sahib (RA).

However, since he had washed away the material filth within him, he did not question the proposition, and without any delay, declared his faith in the prophethood of Prophet Muhammad (PBUH).

Khwaja Ghareeb Nawaz (RA) then said, "Look within me again with the eyes of your soul."

When the sadhu looked again, he saw that the heart was shining bright, free from the blemish.

Surprised and happy, the sadhu joined his hands and pleaded with Khwaja Ghareeb Nawaz (RA),

"I request you to explain this mystery to me. How did my accepting the prophethood of Prophet Muhammad (PBUH) cleanse your heart?"

"The bright and illumined soul in whose heart you saw a blemish was not mine, but yours. Even after attaining so much strength you were unaware of spiritual knowledge."

He added, "Spiritual knowledge gives us the awareness that the heart of every individual is a mirror. It reflects the image of the person who looks into it. That is, a person is able to see their own image in the mirror of every other person's heart. When you looked within me, it was your own image that you saw. You did not believe in the Oneness of God and in the Prophethood of Prophet Muhammad (PBUH), thus, your heart had a dark blemish on it. When you recited the *kalimah* (the declaration of faith in One God and His Prophet), you saw your image bright and pure within the mirror of my heart."

i

# The Mystery of Dark Spot

*When an individual strives within themselves and becomes aware of the flow of energy in them, as a consequence, they move along at the pace of energy and travel to far off places within a moment.*

A sadhu was impressed by the light that emanated from Khwaja Ghareeb Nawaz (RA). Through meditation and spiritual practices, the sadhu had achieved levels of awareness that brought him to the realisation that the nature of the body made of clay is stench, and it is prone to decadence and change.

Those who attain this state of awareness see beyond flesh and blood, that is, they see a body made of lights. The body of light is like fabric, woven with numerous threads, following a warp and weft knitted structure. On this fabric made of light, there are numerous patterns and designs. These patterns formed are actually the features of a human.

Light is free from spatiotemporal limits and moves freely across the universe. This is why, the body of light within the body of clay has the ability to reach the vastness of the heavens. Its vision is so deep that it can penetrate material objects and witness the reality that lies within them. In other words, the body of light sees what the material eyes cannot. Every person, regardless of their race or religion, can familiarise themselves with the body of light, which also sustains the body made of clay.

We all experience the flow of energy within us. These waves of energy help us feel and understand emotions. This is why when we hold on to another's hand or when we hug a loved one, these invisible waves are transferred into us, and we feel good. These waves, following the laws of electricity, travel along strands of light and reach the brain, thereby giving rise to a pleasant sensation.

When an individual strives within themselves and becomes aware of the flow of energy in them, as a consequence, they move along at the pace of energy and travel to far off places within a moment. They can also go back in time and see what happened hundreds of thousands of years ago and even witness what will happen in the future. They not only see the exterior of things, but also the truth that lies within all beings.

The sadhu looked intently at Khwaja Ghareeb Nawaz (RA), and did not let anything distract his gaze. He then cried with joy, "Oh my God, I am in awe of the beauty that lies in every creation. Lord! You are beautiful and have created everything as such. Thank you for all the blessings, and the opportunity to witness this illu-

around. Those who spend time filling their coffers with pennies and keep close guard on the growing balance are always restless. Their thought remains on making money but not on using it for social welfare, thus it becomes a source of fear and discontentment.

## Environmental Wellness:

One must make sure that their every thought, intent and action is 'we' centric rather than 'me' centric. This will bring positive change in the environment, as we uphold the fact that we must leave a healthy planet for the generations to come. This area of life urges one to take charge of social responsibility towards the planet that we are living in. One could stand up for human right, the rights of animals, work on soil conservation, pursue the purification of water bodies, and keep the surroundings clear of garbage for them and for others. One can be the voice of the planet and help in changing the weather conditions in one's country by planting trees for every tree that is chopped, harvesting rain water, and so much more.

To achieve wellness in all aspects of life listed above, we will need to work on a few pointers as listed below:

- ♦ Set up goals you wish to achieve in the above areas.
- ♦ Study on the most challenging areas for you and devise strategies to succeed.
- ♦ Self-restraint and regulation is very important and therefore, identify your weaknesses.
- ♦ Recognise your habits that restrict your ability to make changes.
- ♦ Offer friendship by approaching people who you normally would not.
- ♦ Surprise yourself by attempting to do things you have never done before.
- ♦ Note your negative thoughts and start digging deeper into their origin.
- ♦ Write down the negative experiences that have shaped you into a stronger and more positive person and save them as positive memories.
- ♦ Make regular attempts to understand your soul's power.
- ♦ Contemplate the happenings through the day and review it for improvement.
- ♦ Focus on what brings out the best and the worst out of you.
- ♦ Study the emotions that you are constantly moving in and out of through the day.
- ♦ Research what kind of attachments you have, and who you have expectations from and why.
- ♦ Keep your focus on your Creator and His benevolence upon you.

channels in their relationships founded on honesty? When one experiences the freedom to be who they are, they allow the other person in the relationship to be themselves too. Such friendships based on transparency and honesty last long against the test of time.

## Spiritual Wellness:

One must make attempts to rise over the attachment of the material existence and move inwards in search of one's true self. Practice of meditation, fasting, and regular prayers are some of the activities that push us towards achieving our potential in this area. To be able to progress, one must find a spiritual mentor who can guide them to greater awareness of themselves and their Creator. This is a journey of realising who we truly are and making efforts to witness our souls and thereafter witnessing our Creator. This dimension also includes inculcating the pattern of thinking of the Prophets (PBUT) and living a pious and humble life, dedicated in the service of God and His creatures, surrendering all results to Him.

## Vocational Wellness:

It is very important that one focuses on how they make a living or what activities they engage themselves in for earning their livelihood. It is important for a person to be passionate about what they do and not merely engage in activities that bring in good income. This will only keep the person motivated for a short period of time and eventually they will begin to feel burdened at work and will be gripped with the feeling of their life being purposeless.

When one is doing what one loves, and loving what one does, this leads to waking up enthusiastic and happy each morning; because one looks forward to the work that is lined up for the day. Work does not feel like work but rather an extended happy time, meeting people and serving them.

People who love their jobs are seen happy with their family, friends and generally with everything in life, as today, most of our time is spent executing our work. It is vital that one does not practice unethical means at work, even though progress may be quicker by adopting such methods, the result is only misery and earning the wrath of God.

## Financial Wellness:

Mankind has paid a lot of attention in this dimension but despite that, they are restless and always in misery.

This is because they have replaced contentment with greed. Nothing is ever enough. When they achieve a certain degree of success, they are constantly wanting more. Real financial wellness is not in stagnating the flow of money in banks or stacking them away in the safes. Money grows when you invest it on growing people, growing communities, growing one's country or growing the planet as a whole. Money grows when you spend it on good causes and when you give it

should I go to find change? What is the benefit gained by changing?" A mind stuck in a whirlpool of negativity and doubt is finally fatigued and drops the idea of change, retreating to its old comfort zone of behaviour and the cycle of misery restarts.

Let us understand the eight categories of wellness.

## Physical Wellness:

This entails the care of the physical body in all respects, so that it can function at its best potential. One must ensure that they feed their body with the right nutritious food. The most important action to take would be to control the portions of what one eats. It is important to exercise the body regularly, especially if one's life is sedentary. One must ensure that they regularly check their body for medical issues and take ample precaution. It is important to remember that the body is a vehicle gifted to us so that we may experience this life and be of service to others.

## Intellectual Wellness:

This segment is all about maintaining a yearning to learn and grow. It is about feeding ourselves with information and concepts that push us to contemplate and create an unending thirst for more knowledge and wisdom within us. One must look for teachers and experts in the fields of individual passion and train themselves constantly. Intellectual wellness is all about sharing what we know, creating pools of knowledge that are new for others, so that it assists the society around us. It is intellectual wellness that leads to new innovations and this becomes the foundation for progressiveness in nations and humanity overall.

## Emotional Wellness:

This is all about managing one's own feelings and emotions and also understanding and empathising with the emotions and feelings of others. The more one is aware of their negative feelings, the more they are in control of them. When one is in control of how they feel, they will not face any emotional outbursts that may have adverse effects. Such people are patient listeners and are never hasty to act. The emotional wellness of a person impacts the quality of their relationships, which results in the next category of wellness listed below – social wellness. People love to be around emotionally stable people and avoid when one is unstable emotionally. Emotionally stability translates to being a trustworthy and dependable personality.

## Social Wellness:

This segment of wellness is all about the health of relationships one has in their life. The parameter of a healthy relationship is to see if one can put the concept of 'us' over 'me'. Is one able to understand people without them having to give an explanation? Is one able to be themselves with those who they love or do they wear a different face? Are the communication

i

# Dimensions of Wellness

*Real financial wellness is not in stagnating the flow of money in banks or stacking them away in the safes. Money grows when you invest it on growing people, growing communities, growing one's country...*

When people talk about wellness, the first thing that strikes them is physical health, that is, eating good nutritious food, adopting an exercise module, maintaining their ideal weight, working towards a disease-free body and more. But the concept of wellness is much more than wellness of the body alone. When you think of wellness as a holistic concept then, many facets come forth. As we are spiritual beings operating out of a physical body, wellness should be encompassing the wellness of both our materialistic and spiritual existence – that is, our body and spirit. So, what is the lifestyle that we must adopt to live a life full of enthusiasm, passion, zeal, happiness, bliss, joy, love and more that will lead us to explore our highest and best potential?

Wellness suggests a process of self-care based on self-awareness. Self-care and self-love are concepts that are viewed by many of us as negative and are termed as acts of selfishness. But putting yourself as number one on the priority list is essential if you wish to be of service to mankind. It is only when you love yourself that you will be filled with love that you can invest on others. It is only when you learn how to care for yourself that you will care for others without expectations. When you lack love and care in your life, you will not perform acts of service without expectations. A self-neglecting person can never serve humanity to the best of their potential.

There are eight areas or dimensions of wellness that we can focus on to be able to give our best to the universe; they are, physical, intellectual, emotional, social, spiritual, vocational, financial and environmental. How well you are performing in each of these areas, define the quality of life you are leading. These dimensions, become the parameter to gauge your physical, mental, emotional and spiritual health. When these eight dimensions are at their peak, one lives their best life, inside and out.

Mankind needs to master two major aspects to get themselves to achieve their best in these eight dimensions; which are, will power to rise over desires and break the negative circle of doubt, and surrender to faith. Mostly, the reason why we do not succeed is due to our fears that come forth from the thoughts of doubt. Each time one steps forward in the direction of change and improvement, they are gripped by questions in their mind, "Why should I change? How will this change help me? When is the right time for change? Where

and Innocence hugged Love on her response.

Fear could not tolerate losing the argument, and he stood up in anger, “Enough of this nonsense. I can’t live in this house anymore; you people will drive me insane.”

He went into one of the rooms of Existence, packed his bags and woke up his son Grief, who used to sleep all day long.

“I can’t leave him here in this house,” Fear said. “Ever since his mother Despair left, no one has ever cared for him except me.” With that, Fear left.

Love, Innocence, and Curiosity breathed a sigh of relief as they saw them leaving.

The doorbell rang after some time. Love opened the door to a beautiful yet needy person, who introduced herself as Obedience. “I have nowhere to live,” she said. “Can I live in your house?”

They all welcomed her warmly. They were living happily when shortly after, a new member joined them, called Belief. Belief was in search of a home illuminated by Love, Curiosity, Innocence, and Obedience.

Love kept her doors open for everyone, and thus, they all greeted and welcomed Belief into their home. Love then prayed,

“May every existence be blessed with such entities. Amen.”

❊❊❊

## River of Love

“My Beloved is always with me.”

— Qalandar Rabia al-Basri (RA)

❊

“The chemistry of mind is different from the chemistry of love. The mind is careful, suspicious, it advances little by little. It advises, ‘Be careful, protect yourself.’ Whereas love says, ‘Let yourself go!’ The mind is strong, never falls down, while love hurts itself, falls into ruins. But isn’t it in ruins that we mostly find the treasures? A broken heart hides so many treasures.”

— Hazrat Shams Tabrezi (RA)

❊

“Love is represented by fire, Reason by smoke. When Love bursts into flame, Reason is forthwith dissipated like smoke. Reason cannot coexist with love, for love has nothing to do with reason. If you ever witness the unseen world, then only will you be able to realise the source of love. By the fragrance of love every atom in the world is intoxicated. It owes its existence to the existence of love.”

—Hazrat Fariduddin Attar (RA)

❊

“Oh Khusrau, the river of love runs in strange directions. One who jumps into it drowns, and one who drowns, gets across.”

— Ameer Khusrau (RA)

"The rebellious! Their rebelliousness obscures them from the truth. Such ignorant people are also insecure. Disobedience takes away their wisdom.

Being ungrateful and hasty is foolishness. Such people are burdened by doubts and fears, and it is the lowest state of existence; so much so that a person with such attributes is no longer affected by delicate words."

"What's the solution then?" Curiosity asked.

Love replied, "*Ba adab, ba Naseeb* (Civility is boon). We have covered ourselves with layers of darkness and ignorance; hence we should acquaint ourselves with the knowledge of the Merciful."

Fear vehemently interrupted, "Impossible! It is utterly impossible for a sane man to give up on his thinking, knowledge and consciousness. Bah!"

❊❊❊

Love peacefully said, "Those who are on the quest for truth are led to the right path. God says in the Quran,

"As for those who strive in Us, We surely guide them to Our paths, and lo! God is with the good." (Quran, 29:69)

"But how can we learn all this?" Curiosity continued with his questions.

"We must first learn to forgive," said Love, "Human consciousness ascends through forgiveness; through such humility, the humble human discovers the subconsciousness and thus, the journey to transform from coal into diamond begins."

"I disagree!" Fear exclaimed. "What's wrong is wrong, and forgiving a mistake is a mistake in itself."

Innocence ignored Fear's anger and asked fearlessly, "What sort of a person does one become after this transformation?"

Love replied in a mellow voice, "Such people can make pure pearls by touching droplets of water. Things happens to them with their consent. Their one glimpse and span of attention can cure the sick; iron melts in their hands, and one touch can flow springs in deserts. They can turn a pile of dust to gold and abandon it. If they play a flute in the wilderness, birds and wild animals gather and sit before them obediently. Dry rivers turn to oceans, and raging rivers can calm down with their order."

Fear sarcastically remarked, "Even a magician can do this. Will you call a magician a diamond too?"

"What do you mean?" Innocence appeared confused.

"Look dear!" Fear spat. "A surgeon and a killer, both cut the body. So what's the difference between the two?"

"There is a difference in their intention!" Love said.

Curiosity nodded in agreement

asked, "What does this phrase mean — Can a diamond be cut by a flower's petal?"

He then picked up a knife and made marks on the bread dough that Love was rolling. She smiled and gently took the knife from her brother's hand, and said, "Let me see where it is written. Innocence too inquired about this moment ago."

"Look, it is written right here," Curiosity said.

She quickly read the text in the book, and said, walking towards the lounge, "We will discuss this after dinner."

❊❊❊

"What's going on?" Fear inquired as he entered the room where Curiosity and Innocence were sitting.

"We are here to listen to a story about a diamond and a flower petal," Innocence exclaimed happily.

Fear said, "You kids should be going to bed early instead of listening to these useless stories. There is no use listening to Love, lest you start thinking like her. She is insane. Look at her, despite having so much education, she has no dowry, bank balance, employment or assets!"

Love then entered the room, carrying a tray of food and said, "I have the asset called inner peace, brother! One which can heal the sick. And you need not worry, they can stay up late, it is Sunday tomorrow." She then served food to everyone, however, Fear's eyes remained pinned to the television screen.

❊❊❊

After dinner, everyone but Fear gathered in their garden. It was a full moon night. Love looked graceful in a white dress. She did not want Fear's insecurities to affect their peace or to have any impact on her younger siblings. She wanted to raise them in an environment filled with faith and belief.

Innocence brought a bunch of jasmine flowers and gave them to her beloved sister, while Curiosity sat patiently. Fear also joined them as at that moment, nothing that interested him was on T.V.

Love asked her younger siblings tenderly, "So, what was your question?"

She replied, "There is a couplet mentioned in this book, it says,

'Can a diamond be cut by a flower's petal?

Words of wisdom do not affect a foolish man.'"

Love said, "What this means is that when an ignorant person sets out on a journey within themselves, the desire to transform from coal into diamond arises within them."

Fear interrupted, "This is impossible. How can you call a non-living mineral a living being? And journey means to travel somewhere outside; only insane people keep peeking within."

"Who are the 'ignorant men', Love?" Curiosity inquired.

i

# Existence of Love

*"Being ungrateful and hasty is foolishness. Such people are burdened by doubts and fears, and it is the lowest state of existence; so much so that a person with such attributes is no longer affected by delicate words."*

There was a beautiful small cottage in a lush green valley called Existence, where four siblings lived: Innocence, Curiosity, Fear, and Love.

One fine afternoon, Love, the eldest sister, was cooking as Curiosity was busy inspecting his bike, and Fear was watching the news.

Innocence was clad in a pink frock and her hair was styled with two tiny ponytails laced with ribbons. She went to her sister in the kitchen and said, "I have found a book while playing in the lawn. It reads that 'Can a diamond be cut by a flower's petal?' What does this mean?"

Love hugged her younger sister and said, "You must be tired after playing. First, have some milk, and then we can discuss this later in the evening after dinner." Saying this, Love continued preparing the meal.

During this, Curiosity entered the kitchen with his grease-stained hands and asked Innocence, "Did you find a book in the lawn?"

Love, who was busy cooking, pointed towards the book and said, "Here is your book. But you must first wash your hands before touching it."

Their brother Fear screamed from the T.V lounge, "Nobody should leave the house after evening. Keep the doors and windows shut. Who knows what might happen? And Love, please come here. I want to talk to you about something."

Love lowered the flame, and while entering the lounge, said, "Brother, at least turn down the television's volume!"

Ignoring her, Fear said, "Look, you need to be careful with spending money. You are only friends with the needy, always helping them out with clothes and other necessities. There are difficult times ahead. If you don't save money today, all of you will suffer tomorrow. And keep a close eye on Innocence, don't let her go out. Also, ask Curiosity to look for a job along with his studies. He is always busy wasting time in books and with his tools. Tomorrow, only money will come in handy."

"Yes, brother," she replied and went quiet.

"Now give me my medicine, lest my condition worsens," he said annoyed.

Love handed him what he asked for and silently walked towards the kitchen.

❊❊❊

Curiosity went to his eldest sister Love with book in his hand and

ماہنامہ

# روحانی ڈائجسٹ

کراچی

یہ پرچہ بندہ کو خدا تک لے جاتا ہے
اور بندہ کو خدا سے ملا دیتا ہے

چیف ایڈیٹر: خواجہ شمس الدین عظیمی

مینیجنگ ایڈیٹر: ڈاکٹر حکیم وقار یوسف عظیمی

روحانی ڈاک میں آپ کے مسائل و مشکلات کا حل پیش کیا جاتا ہے۔

شعور کے پس پردہ لاشعور کی حقیقت کی پردہ کشائی کی جاتی ہے۔

خواتین کی زندگی کو پُرکشش، پرسکون بنانے کے لئے مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔

بچوں کے لئے کہانیاں اور بہترین مستقبل کے لئے راہنما اصول بیان کئے جاتے ہیں۔

دین و دنیا کی خوشی حاصل کرنے کے لئے روحانی ڈائجسٹ ہر جگہ دستیاب ہے۔

things, and when things do not work as per their strategy and planning, they begin to panic and develop anxiety.

To add to this, mankind's wants and desires themselves are constantly fluctuating and that is why they are never happy. As a result, when they achieve something, they have their next wish or want already written on the board. Mankind is therefore constantly pushing themselves into cycles of confusion and a lack of clarity. They are never sure of what they want to achieve or what will make them truly happy.

To summarise:

- We suffer because our bodies are impermanent and are bound to deteriorate, decay and die.
- We suffer because whatever we get attached to in this transitory world is impermanent.
- When something is not forever, mankind goes into suffering.
- As nothing in this world is forever, everything that belongs to this world causes suffering.

The moral to take from this is that as everything in this world is impermanent, we must value them before we may lose them. We must treat them with the utmost respect and give great attention and love to everything we come across in the current moment. As they say, live life as if there is no tomorrow, the now in today is all you have.

When a revered man attended the funeral of his mother, he said this on the impermanence of things,

"I realised that things in this world are nothing. When my mother in the past, overwhelmed by her affection and love for her only son – me – wept bitterly and sent messages begging me to come back to her, I never let it interrupt my practices. I always thought my mother was too young to die and that even if I stayed away from her for a few years it was okay. And without realising how impermanent life is, I kept postponing my return to her year after year until she died and left me knowing that I will never see her again. She is no longer in a place where I can look for her, see her, or in a place where if I spoke, she could hear me. She had already set out on the infamous road called death."

A war captive was thrown into the dungeon. He could not sleep thinking that he would be interrogated and tortured tomorrow.

In that state of restlessness, the words of his spiritual master echoed in his heart, "Tomorrow is not real, it is an illusion."

Heeding to his master's words, he spoke to himself, "When tomorrow is an illusion, then so is today."

With this thought, he peacefully drifted into sleep.

Let us now see how being in the present moment assists us in dealing with pain. We do not feel the intensity of pain until we begin to describe or define the sensations we are feeling.

When we watch pain through the deeper states of mindfulness, we realise that we cannot allocate any one point to the pain we are experiencing, because, when we focus on a particular spot, the pain seems to move a little further away. And finally, when we feel we can locate the exact spot of pain, it vanishes. It is then that we realise that our attachment to our story of pain and our desire to hold on to it is what creates long lasting pain.

We further accelerate the feeling of pain by associating it with similar old experiences and we realise that the pain we are feeling in the current moment is nothing but a cumulative memory of the present and the past. It is known by science that our entire layer of skin changes in 28 days. How then do skin diseases still exist if the diseased skin has already shed? It is the patient's deeper desire to make things permanent that latches on as memory to the incoming new skin cells, and hence they grow in the old format of memory.

The more we focus on our existence as a mind and body, we realise that there is nothing in them we can hold on to. At times you may love the thought that struck you and before you find a pen to write the thought down, you have lost it and cannot remember it. When you compare two pictures of yourself across a few years apart, you will be surprised how much you have changed. At times you are not able to recognise yourself in older pictures because of the drastic changes your skin and features have gone through.

When we contemplate the profoundness of the nature of impermanence, it will open doors to enlightenment and liberation. Speaking on attachment, a learned philosopher once said, "If you let go of a little, a little peace comes to you. If you let go of a lot, a lot of peace comes to you. If you let go completely, you will remain in complete peace."

The only happiness that is reliable is that which is based on letting go of all attachments in this impermanent world.

Mankind is constantly trying to recreate happy moments and wishes to make them permanent, and thus push themselves into deeper and deeper levels of illusions and misery. Just as one can never build a permanent castle out of sand, no one can build anything or save anything that will last forever. But mankind's greed makes them want everything forever. The slightest shift in their current status of living agitates them and they slip into states of despair, fear and lack of faith.

Mankind considers their greatest power to be in control of

hair. It is then that they begin to re-evaluate their priorities and values and try to make amends for their actions in the past. Even at this first level of awareness on impermanence, mankind can gain a lot of wisdom.

Now coming to the awareness on impermanence based on the deeper understanding or the inner eye – to do this – one must practice observing the present moment. When we start focusing on the present moment, the first thing that our attention flows to is our breath. We begin to see how every breath we inhale and exhale is not ours, yet when it is moving inside us, we identify with it. And when we exhale the breath out of us, the same breath that was our identity and reference to being alive is no longer us. It perhaps becomes the identity of the plant that inhales our exhale.

When I inhale oxygen, I am alive and that breath of oxygen within me is referred to by my name. However, when I exhale it as carbon dioxide, the plant next to me inhales it and the same air is referred to as the plant. Is this impermanence not absolutely fascinating? What was me a few seconds ago is now the plant and the circle is never-ending.

The deeper mind then observes how the body fluctuates at all times too. When one practices concentrating on the body in silence, one realises how the trillions of cells in our body are constantly in motion and performing one action or another.

> It is known by science that our entire layer of skin changes in 28 days. How then do skin diseases still exist if the diseased skin has already shed? It is the patient's deeper desire to make things permanent that latches on as memory to the incoming new skin cells, and hence they grow in the old format of memory.

We will start feeling the innumerable itchy spots on our skin, or feel the pulsating veins, or how the throat wants to cough, or the sneeze that is just about to flow out of us. The clear skin has suddenly formed a rash and a bruise we saw the previous day has completely healed with no marks in just a matter of hours. Witnessing the minute details makes us internally aware of how everything is short lived.

The deeper awareness comes when we understand that if the feelings of both the body and the mind are momentary, then if we wait for it to pass, it will pass just like everything else in this universe. We need not make any efforts towards releasing ourselves from our current situations.

The wisdom is to not react and just be an observer of what is happening within us and around us.

i

# Impermanence

*When I inhale oxygen, I am alive and that breath of oxygen within me is referred to by my name. However, when I exhale it as carbon dioxide, the plant next to me inhales it and the same air is referred to as the plant.*

Suffering is not an integral part of this impermanent world; rather suffering arises when we try to hold on to the impermanence in this world and put all our efforts into making it permanent.

When our attachments disappear, so do our sufferings. Therefore, the end to suffering is not running away from this transient world, but it is to stay away from the clinginess or attachment we have towards it.

The most important question to ask is, is it really possible for us to rise over the suffering associated with impermanence? When we look deeper into the aspects of the transitory world and our growing attachment towards it, the insights may show us how futile it is to find lasting happiness within it. This realisation is the break through point that mankind needs to attain enlightenment.

We can try to see impermanence in three ways:

- The first way is the general understanding and perception of impermanence.
- The second is by seeing it through the eye of intuition or our deeper knowing and understanding.
- The third is by seeing impermanence as the doorway to liberation.

The general understanding of impermanence is what we refer to as the deterioration of something or death of someone. We also understand impermanence as change. For example, the seasons change, moods change, desires change, the weather changes, the people we like and dislike change also, etc.

There is a profound saying, "This too shall pass." When one realises how everything changes, and nothing lasts, it brings about a huge sense of relief in people and they ease up even in the toughest of circumstances. Also, when we realise that no matter how rich or poor, or how good or bad, death and sickness strikes all without differentiation, one experiences feelings of love and compassion for all.

Even though people see death all around them, they live believing that death is far away from them. This is the greatest wonder of this transitory world. People seem to be busy in accumulating wealth for a brighter tomorrow as if they have been guaranteed innumerable years of life in the future.

The realisation often strikes people that they are impermanent and will die sooner or later when they stand at the tail end of their lives with wrinkled faces and grey

He replied, “Reposing trust in God does not mean giving up on material resources or sitting idle. This would be highly disrespectful towards the material resources, which God Himself has created for us. These mediums and resources are like a door created by God for us to reach out to what we desire. But, if one closes the door thinking that God will provide the resources in another way, then this is an act of disrespect because the door is made by God and the proof of this is that the door has been left open for us. We must not therefore, close the doors that have been opened for us. Truly, it is God Who has power over everything. He has the power to grant you means through whatever He feels befits you. Hence, follow the procedure prescribed for you.”

Until a seeker of the inner world does not look within themselves, the journey does not ensue. The preparation of the mind to look within, is part of the preparation for this journey. This may take many years. One of the practices that assists in looking within is meditation.

Hazrat Baqi Billah (RA) states,

“The meaning of meditation is to wait. The intensity of waiting is proportionate to the intensity of desire. It is a state where a seeker surpasses their power, and immerses in the sea of Divine love to witness Him. One witnesses according to their capacity. This state of meditation is not achieved by all.”

Regarding the relationship that is shared between a spiritual master and a disciple, Hazrat Baqi Billah (RA) said, “When a disciple falls in love with their spiritual master, they remain restless and find their master present everywhere, whether they are physically there or not. This restlessness is their desire to give up on duality. A disciple should remain in continuous connection with their teacher. This method is dependent upon a connection from both ends.”

In a gathering where the love for the *Zaat* (self) and attributes was being discussed, Hazrat Baqi Billah (RA) said,

“The love based on attributes is when someone loves a person for their bravery or knowledge. This type of love is dependent upon the attributes of knowledge or bravery. If these attributes were to be taken away from the person, the love for them will begin to recede too. However, when we talk about the love for the *Zaat*, we refer to the love that is beyond the attributes possessed. It is not the type of love that increases when certain attributes are associated with a loved one, or which fade when those attributes are taken away from them. This is not love.”

V

immediately had a thought come to mind that he should contact the local bread maker, who was also one of his devotees.

He ordered a servant to inform the bread maker to prepare food for his guests, and to pass on the message that he would be paid as per his wishes.

After the meal, Hazrat Baqi Billah (RA) said to the bread maker, "The meal was delicious and was greatly appreciated by the guests. Do let me know what you want in return for this service." The bread maker said, "I want to become like you." Hazrat Baqi Billah (RA) tried to dissuade him by saying, "Ask for something else. This desire of yours is well beyond your capacity. If the vessel is filled with more than it can hold, it will either overflow or break."

The bread maker did not stop insisting however, and Hazrat Baqi Billah (RA) took him to his room. When they finally came out, they both looked identical. The difference between them was that Hazrat Baqi Billah (RA) was conscious and the bread maker was in ecstasy. Seeing this, people were able to guess who amongst the two was the bread maker. The bread maker remained unconscious for three days and thereafter died.

He had demanded for knowledge that was beyond his capacity. It is the master who first increases the capacity to behold knowledge in a student before transferring knowledge.

A master trains their disciples in accordance to their nature. The purpose of this training is to increase the capacity of the student. The master ensures that the student passes through innumerable highs and lows of life so that the student's mind remains focused on God at all times through these situations.

The honourable spiritual master, Khwaja Shamsuddin Azeemi says, "A spiritual journey is a constant test that shows no test results, nor does one feel like they are in an examination room. It is a secret ledger that no one is given even a hint of, except the master who is aware of the happenings."

The spiritual journey can only be travelled with perseverance and patience. The capacity of the seeker increases through the following habits.

Hazrat Baqi Billah (RA) says, "The one who desires to travel this path must first seek forgiveness with sincerity, then have faith, *tawakkul* (complete trust) patience and focus. They must remain busy in the remembrance of God. This is called the journey back home."

Someone once asked Hazrat Baqi Billah (RA), "What is reposing trust? Is the abandonment of material resources considered reposing trust in God?"

such a long period of time and now you are leaving me yet again. I am now unable to tolerate this separation!"

The state of his mother disturbed him greatly. He was an obedient son; however, he could not disobey his master either. He told his master of the predicament he was facing, and informed him that he wanted to obey his master's orders too. The master heard him out and said, "The command for you to proceed towards India is from God, and it is therefore your task to convince your mother."

Hazrat Baqi Billah (RA) approached his mother and told her, "Life is a gift to us from God. I have been ordered to travel to the subcontinent. Please bid me farewell happily in your prayers."

Hearing this, his mother hugged him and blessed him saying, "I have always prayed that the blessings of God remain with you. Go! May He keep you safe and be on your side."

On reaching the Indian subcontinent, Hazrat Baqi Billah (RA) laid the foundation of the Naqshbandia Sufi Order. Inspired by his ability to serve and the compassion he had for people, there were many who became his students.

Hazrat Baqi Billah (RA) states, "Loving all the creatures of God and being in service to them is the system of the saints. It is through this power of love and service that the friends of God become the beloved amongst mankind."

"People approach saints in search of tranquility of the heart. Through obedience to these saints, they become examples of peace themselves."

He also told his followers, "In order to achieve peace of heart and concentration, one must spend one's life in simplicity, earn through fair means, and avoid impudence."

In reply to a letter written by one of his students, he wrote:

- Maintain the state of ablution.
- Do not criticise.
- Do not look down upon anyone.
- Avoid sinning.
- Do not hold grudges or resentments.
- Deal very gently with those who are weak.
- Offer *Tahajjud* prayers and recite the *Kalima Tayyaba* (Testimony to God) during *zikr* (remembrance).
- Consider the Almighty God as Omnipresent, because God is closer to us than our jugular vein.

Once it so happened that there was nothing available in Hazrat Baqi Billah's (RA) house to serve guests. He prayed to God, "My Lord! Please arrange resources so I may serve the guests, and so they do not leave here unserved." After submitting his prayer, he

dervish who had clearly shown his dislike towards this request, attacked Raziuddin continuously. Raziuddin endured it and remained firm in his intentions to stay with the dervish.

After a while, they continued their journey once more. On the way, the dervish entered a house and summoned Raziuddin to sit before him. Raziuddin was confused as to what was appropriate and inappropriate to say and seeing this, the dervish said, "Dear son, do not be afraid. You have completed the test. You now deserve a reward!" The dervish brought out some sweets in a box and offered them. The rest of the time thereafter, Raziuddin spent in spiritual practices.

The dervish asked him, "What is your name?"

"Raziuddin," he replied.

The dervish then said, "You have been bestowed with this grace solely due to the prayers of your mother. You will be known as 'Baqi Billah' from now on."

Time passed and Hazrat Baqi Billah (RA) completed his tenure of training under the dervish. The dervish said to him, "Go and serve your mother! She constantly cries in your remembrance. With her prayers, approach Khwaja Muhammad Amkanagi (RA), take the pledge of allegiance, and offer him my greetings. You will cover further milestones on this journey under his guidance."

Though Hazrat Baqi Billah (RA) did not want to leave his master, he dared not disobey him.

Heeding the instructions of his master, he spent some time with his mother, took her blessings, and travelled to meet Khwaja Muhammad Amkanagi (RA), requesting that he be accepted as a spiritual student.

"You have been under my tutelage from the day of your birth in this world. The time you spent with the dervish was part of your training." Saying this, Khwaja Muhammad Amkanagi (RA) took Hazrat Baqi Billah (RA) under his supervision. He taught him the spiritual knowledge, and granted him successorship. On hearing that successorship was given to him after being a student for such a short period of time, the other disciples felt envious.

When Khwaja Muhammad Amkanagi (RA) became aware of these feelings, he addressed them, "Dear friends, you are unaware! This man was sent to us after having completed his training. He only needed to amend a few things when he came here. Therefore, whosoever comes to us prepared like he has, will also be sent off quickly."

Hazrat Baqi Billah (RA) was ordered to travel to the Indian subcontinent. He visited his mother to seek her blessings before he travelled. She said to him in sadness, "You have visited me after

"I will keep trying my very best until I breathe my last," Raziuddin responded.

The man laughed at Raziuddin and suggested that it was best if he gave up on his idea and returned to his home. Raziuddin paid no heed to the man and moved on.

It is narrated that one day as Raziuddin travelled to an area which was covered by snow and there he met a dervish who did not seem to be bothered by the cold. Raziuddin felt strongly drawn towards him. However, the moment the dervish saw Raziuddin, he walked away.

Raziuddin followed him.

The dervish said in a reprimanding tone, "Why do you follow me?"

"I seek your companionship," Raziuddin replied.

"What can I do for you?" the dervish asked.

Raziuddin requested, "Please allow me to stay with you."

"No! Not by any means will I do that! Take your path," the dervish said.

Raziuddin requested again but the dervish remained silent. Taking the silence of the dervish as somewhat consent, Raziuddin accompanied him along the path. At one point, all of a sudden, the dervish began to run. Raziuddin tried to follow him but slipped on the snow and fell down. Seeing this, the dervish laughed at him and said, "Your footsteps have faltered already!" Raziuddin took this as a sign. Standing up again, he continued his journey.

After a while, they both stopped for a moment.

The dervish asked him, "What is it that you want from me?"

"I am engulfed in Divine love. I am here to seek nearness to God," Raziuddin replied.

The dervish laughed and said, "What nearness? I do not know of it."

Upon hearing this, Raziuddin became upset. However, after thinking on it a moment, he thought that maybe the dervish did not want to reveal his true self. Raziuddin expressed this thought to the dervish who immediately lashed out in rage at him. Continuing on their journey, he saw the dervish entering a certain house. After waiting a really long time for the dervish, Raziuddin finally knocked on the door. A young man opened the door. When Raziuddin asked him about the dervish, the young man expressed that he was unaware of anyone having entered the house and that there was a misunderstanding. Raziuddin was certain of what he had seen however, and sat down determinedly waiting.

It was long before the dervish came out of the house, who smiled upon seeing Raziuddin waiting for him. Raziuddin pleaded, "Please have mercy upon me. Allow me to stay with you." The

i

# If the Vessel is Filled...

*"People approach saints in search of tranquility of the heart. Through obedience to these saints, they become examples of peace themselves."*

When nature chooses to send pious people to earth, their arrival is revealed upon their families through dreams. Raziuddin was born in the city of Kabul, Afghanistan in 1564 A.D (971 Hijri). His parents often noticed that their child was surrounded by a Divine halo. Gradually this led them to realise that their son was not amongst the ordinary. There was something special about him. They prayed, "Oh Lord, what we feel and think that our child will turn into, please fulfill our wishes."

Dear readers, the prayers of parents are heard and accepted. Children should not hurt their parents and give them the utmost respect.

Raziuddin was taught by many renowned teachers. One amongst them was Maulana Sadiq Halwai, who recognised the spiritual abilities that God had bestowed upon Raziuddin. He took Raziuddin with him to Mawara al-Nahr to further his education, where they stayed for many years.

When Raziuddin returned, his heart had transformed and a strange uneasiness in his conduct was becoming more evident. He seemed to be in constant search of someone. His entire existence was being drawn towards the spiritual journey. Seeing her son in this state, his mother prayed for him, "O Lord! Please have mercy on Raziuddin and grant him what he seeks."

Finally, Raziuddin decided to further his journey and vowed that he would not rest until he found what he was seeking.

Once someone asked Raziuddin, "You are constantly travelling. Do you not feel tired? Do your feet not get blistered?"

He replied, "Why would I not? Indeed, the physical being tires and my feet do develop blisters."

"Why then will you not settle somewhere?" the person continued to ask.

"My soul is very restless," Raziuddin replied.

"How long will you continue to travel?"

"Until I reach my destination."

"And when do you think that will happen?"

"When I am annihilated."

"What is it that you seek?"

"I am in search of a person who will assist me in acquainting myself with the states of ecstasy that one achieves through their closeness to God."

"When you have not achieved any success for such a long time, why are you so sure you will find the guidance you need now?" the person finally questioned.

roundings upon them is so grave that they never achieve relief that is enough to step into the sub-consciousness. In order to enter into a higher zone, one must make efforts to be free from the clutches of crowded thoughts.'" (*Loh-o-Qalam*)

The master explained further, "It is a must that we empty our crowded thoughts. Because, when thoughts recur, they create doubts. The words of God negate doubt and affirm the law of concentration. When God intends to do something, He says, 'Be' and it becomes."

"Remember! A lack of concentration adversely affects speed and movement, which consequently paves the way for space to dominate over time. When thoughts are not centralised, a write up that could be completed in a day, is not accomplished even after a week."

• • ——————————— • •

Dear friends, there is no change and delay in the works of God. As per Divine law, when things are seen through the restricted consciousness, one witnesses contraction and expansion in them. God has blessed us with the ability of the *Sultan* through which one sees that there is nothing near nor far, and that the process of expansion or contraction does not exist in reality.

Respectable ladies, gentlemen, and students, you may ask questions and write to us for further understanding.

May God protect you.

> zones of the heavens and the earth, pass ye! not without authority shall ye be able to pass." (Quran, 55:33)

• • ——————————— • •

A student asked his master, "We see and reap the benefits from the sun and the moon. Does our sight cross the terrestrial zone when we see them?"

The master replied, "The laws of God are unchangeable. The reason one sees the sun and the moon is because they are familiar with the atmosphere that is beyond the terrestrial bounds, but it certainly does not mean that we are acquainted with what lies at their core. We are simply aware of the impact they have on us. The words 'acquaint' and 'impact' are indicative of the law of reflection. The consciousness only sees a reflection, irrespective of what the celestial bodies are themselves."

The student asked, "If what we perceive is the reflection, then who are you and I? Are we reflections too?"

The master answered, "The universe is like a globe. The earth and sky and the creatures within them, including you and I, are all reflections. The light beams from elsewhere, and that is where the true being is stationed. A layman sees only the body enclosed in matter, but their subconscious mind observes the light within the body. The globe of the universe contains all forms and features. When we look at matter, we look at the entity confined in the globe. But in dreams, the layer that conceals the matter becomes so subtle that one is able to see the *hayula* (prime material). We assume that we are acquainted with our surroundings, both within and outside the globe, but the truth is, what we see is a mere reflection. God has made the universe or earth a reflective mirror so that individuals may increase their capabilities, and be attentive towards seeking the Truth. This is possible only when one becomes cognisant of the *Sultan*."

The student asked, "What is the *Sultan*? And how can one familiarise themselves with its knowledge?"

The teacher replied, "*Sultan* is a sight that sees the unseen realm. Abdal-e-Haq Huzoor Qalandar Baba Auliya (RA) has shared a law to acquire this knowledge. He says,

> 'The more one grows older, the more one is engrossed in their surroundings. As a result, the elements around them are stored in their minds in a sequence with all of their features, and this helps them locate things easily. The impression of the sur-

and thinking, which is described in the Holy Quran as follows:

> "If thou obeyedst most of those on earth they would mislead thee far from God's way. They follow naught but an opinion, and they do but guess." (Quran, 6:116)
>
> "And they have no knowledge thereof. They follow but a guess, and lo! a guess can never take the place of the truth."
>
> (Quran, 53:28)

• • ——————————— • •

The nature of earth has been explained in various chapters of the Quran:

> "And He it is Who spread out the earth and placed therein firm hills and flowing streams, and of all fruits, He placed therein two pairs. He covereth the night with the day. Lo! herein verily are portents for people who take thought." (Quran, 13:3)
>
> "Have We not made the earth an expanse, And the high hills bulwarks?" (Quran, 78:6-7)

Like all other creations, earth is also a creation whose responsibility is to nurture vegetation and fruits of various kinds. One of the traits of earth is to swell or expand. The Almighty Lord has spread earth out and placed therein mountains and flowing streams to sustain the process of expansion. Expansion not only increases the time and space of a creation but it also decreases its speed. Contrary to this, contraction reduces time and space and increases the speed of an object. This is why, God has pegged mountains onto the earth to keep the physical movement of earth in sync with the consciousness of those who are not aware of the sub-conscious movement.

Contraction is an intrinsic ability of earth but for the continuity of life, God has expanded earth and nailed mountains upon it. The physical trait of the mountain is gravity and, when gravity takes root, it distances one from reality. However, the inner state of the mountain is free from gravity. God states it in the Holy Quran:

> "And thou seest the hills thou deemest solid flying with the flight of clouds: the doing of God Who perfecteth all things. Lo! He is Informed of what ye do." (Quran, 27: 88)

The process of expansion and contraction is directly proportional to the process of repulsion and attraction respectively. Attraction is the inner facet, and repulsion is the outer facet of earth. One has to be free from the grip of gravity to know what lies beneath earth.

> "O ye assembly of jinns and men! If it be ye can pass beyond the

is called the earth, and the side we are unaware of is known as the sky. The earth and sky are the limits of one's insight. When we enter the zones of the skies, we find each stratum inhabited by different creations. What is the sky for us, is earth for those living on it. The Holy Quran sheds light on it as follows:

> "And verily in the heaven We have set mansions of the stars (*Burooj*), and We have beautified it for beholders. And We have guarded it from every outcast devil." (Quran, 15:16-17)

According to the words of God, one cannot recognise the beauty of the *Burooj* with satanic thought patterns. Only the sight that is free of confinement can behold them.

• • ——————————— • •

Every creation is influenced by their surroundings. For example, marine creatures carry the traits of the environment they live in, the impact of the land is apparent on its inhabitants, and the residents of the sky are influenced by the elements therein. The earth is confined in clay and the skies are zones of light. Understanding this propels one to think:

- Why do the objects outside the terrestrial zone appear to us in earthly forms?
- Do we actually look out of our earthly zone at all?
- Everybody who looks at the sun or the moon considers them to be round discs, and the stars to be lit as if they were lamps. Are they truly as we see them?

The pattern with which we see things on earth, becomes the base for how we see the bodies of the sky. Therefore, the sight that is influenced by the terrestrial zone, does not see the sun, the stars, the moon or space – it sees its own mind in them. The mind observes a thing according to its aptitude. For instance, the things that we see through a coloured glass are not the same colours as we see them without the glasses. When one sees the sky through sunglasses, it looks different to what it really is. The sky did not turn dark, it was the shade one saw it through that made it dark. One does not see the celestial bodies as they are, rather they see the impression that is left on their minds.

Another example is a state of dreams where one steps into infinity, whilst still being present in the finite zone. Dreams are a zone of light where time and space are different from wakefulness. Instead of observing the light, one witnesses things in dreams in the same way as they would in the state of wakefulness. This is a confined pattern of seeing

i

# Message of the Day

The universe is like a mirror on which light from *Loh-e-Mahfooz* (the Preserved Tablet) disperses, and displays forms and features that are hidden within the light. *Loh-e-Mahfooz* contains the record of every entity, and is a source that helps creations recognise each other. This record helps the creations see life on both the terrestrial and celestial zones. This is why we can see the sun, the soon, and the stars – lives that are different to the terrestrial zone.

As per scientific calculations, the Moon is at a distance of about 250,000 miles from planet Earth and the Sun is about 90,000,000 miles away. One must contemplate the fact that irrespective of this enormous distance, the Sun and Moon appear to be in close proximity to the Earth. However, when attempts are made to reach them through material means, the path leading to them seem to fade away. This brings forth a question, "How does sight reach objects that are at great distances from us, while the material body fails to do so?"

The zones of the earth and sky have different spatiotemporal limits. Spatiotemporal limits exist everywhere, but their presence is not felt in the celestial zone like it is felt on earth. The reason behind this is the frequency of the sight which increases when it travels across the space of the earth and moves into the space of the sky.

• • ——————— • •

There are different mediums with a range of lenses to see and observe things such as eyes, spectacles, binoculars, telescopes or microscopes. However, it is not the lens in them that sees. A lens is merely a medium to see.

Dreams and thoughts are other mediums of sight that surpass the aforementioned modes in terms of speed and function. In these states, one travels to far off places and sees without the help of the physical eye. This phenomenon highlights the fact that the physical eye is not the source of vision, rather, it is only a medium to see things, much like telescopes and binoculars. It is something else that helps one to see.

• • ——————— • •

The earth and sky are deemed as different creations; but contemplation reveals them to be sides of a single entity. The side we are aware of,

# Contents


| | | |
|---|---|---|
| Message of the Day | K. S. Azeemi | 172 |
| If the Vessel is Filled... | Qurat-ul-Ain Wasti | 167 |
| Impermanence | Roshan Sitara | 161 |
| Existence of Love | Nadra Mubeen | 156 |
| Dimensions of Wellness | Umar Tariq | 152 |
| The Mystery of Dark Spot | Fatima Zubair | 148 |
| Circle of Life | Bibi Anuradha (UAE) | 146 |


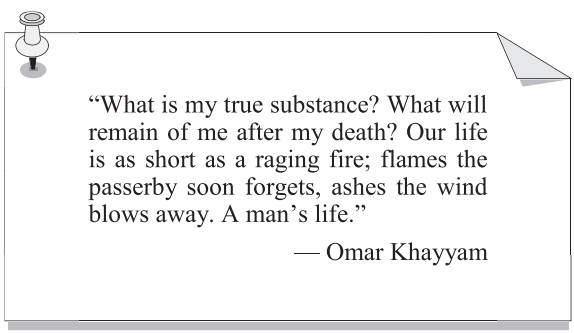

"What is my true substance? What will remain of me after my death? Our life is as short as a raging fire; flames the passerby soon forgets, ashes the wind blows away. A man's life."

— Omar Khayyam

Vol 8 Issue 10 | November 2020 | Rabi-ul-Awwal Rabi-ul-Thaany 1442AH

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Monthly Karachi

# Qalandar Shaoor

Neutral Thinking

(Urdu — English)

Patron in Chief
**Huzoor Qalandar Baba Auliya RA**

Chief Editor
**Khwaja Shamsuddin Azeemi**

Editor
Hakeem Salam Arif

Circulation Manager
Muhammad Ayaz

Furnished by Azeemi University Press. Shah Alam Azeemi, the Publisher has published it at Ibn-e-Hasan Offset Printing Press, Hockey Stadium, Karachi and disseminated at Surjani Town Karachi.

Rs.80/- Per issue. Annual subscription Rs.1080/- with Reg. Post (Domestic), US$ 70/- (International)

**Contact: B-54, Azeemi Mohalla, Sector 4-C, Surjani Town Karachi, Pakistan. Ph: +92 (0)213 6912020**